مختار مسعود کی سوانح نگاری
شازیہ ظہور
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

مختار مسعود کی سوانح نگاری

شازیہ ظہور

کتاب کا نام	:	مختار مسعود کی سوانحِ نگاری
مصنف	:	شازیہ ظہور
طباعت واشاعت	:	بقائی یونیورسٹی پریس سپر ہائی وے۔ کراچی
رجسٹریشن نمبر	:	۱۱/ ۱۰۳
سرورق و لے آؤٹ	:	محمد عاطف فاروقی محمد خرم فاروقی
تاریخ اشاعت	:	۱۵ر دسمبر ۲۰۲۱ء
تعداد	:	پانچ سو (۵۰۰)
قیمت	:	۲۵۰

انتساب

ابّو ظہورالدّین جنت مکاں

اور امّی ہاجرہ بیگم کے نام

جن کی دعاؤں اور رہنمائی کے طفیل میری زندگی کی راہیں روشن ہیں۔

شازیہ ظہور

رفعتوں کو، سلام عقیدت

نقش اول:۔ مریٹوریس پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال

سابق شیخ الجامعہ۔ وفاقی جامعہ اردو

نقش دوم:۔ پروفیسر سعید حسن قادری

(دانشور، محقق، مؤلف، مصنف)

نقش سوم:۔ سید اسجد حسین بخاری

(شریک معتمد۔۔۔ پاکستان آرٹس کونسل کراچی)

اور

محمد زبیر (ناظم۔۔۔ بیدل لائبریری کراچی)

کو

پیش کرتی ہوں، جنھوں نے میرے فکر و شعور کو بالیدگی عطا کی۔

فہرست

تیسرا باب:

چوتھا باب:

پانچواں باب:

فہارس

تقریظ

مختار مسعود ہمارے دور کے اہم نثر نگار تھے اور ان کا مخصوص اسلوب انھیں اردو کے ممتاز نثر نگاروں میں شامل کرتا ہے۔ ان کا شمار بجا طور پر محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد جیسے صاحب طرز نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتابوں میں ثانوی یا ضمنی طور پر ہماری تاریخ کی اہم شخصیات کی سوانح ملتی ہے۔ جس کا مطالعہ کیا جانا ضروری تھا۔

مقام مسرت ہے کہ آپ نے اس کا بھرپور جائزہ اپنے مقالہ میں لیا ہے مقالے میں مختار مسعود کی سوانحی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ شعبہ اردو، جامعہ کراچی بھی مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے ایک اہم موضوع پر آپ سے عمدہ اور وقیع کام کروایا ہے۔

بتاریخ: ۲۰ر مئی ۲۰۲۱ء

پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ

ڈائریکٹر جنرل

ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد

''مختار مسعود کارِ سرکار کے ساتھ ہمیشہ تدریسی، تعلیمی، علمی، ادبی اور سماجی اداروں سے عملاً منسلک رہے اور یہ تعلق سرکارِ منصبی سے سبکدوشی کے بعد تادم آخر قائم رہا۔ اگرچہ بڑھتی عمر کے ساتھ ان کی سماجی زندگی انتہائی مختصر دائرے میں مقید ہوگئی تھی اس کے باوجود ان کے علم وفضل سے استفادہ کرنے کے لیے احباب ''العطا'' پر حاضر ہوتے اور فیضیاب ہوکر جاتے''۔

فتحِ باب

زندگی کے شیریں اور تلخ حقائق، فرد کی کامیابیوں اور ناکامیوں و کارگاہِ حیات میں حاصل ہونے والے مقام و مرتبے کی تفصیلات کو یکجا کر دینے سے سوانح کا ناک نقشہ وجود میں آتا ہے۔ مختار مسعود ان مصنفوں میں سے تھے جنھیں دوسروں کی زندگیوں کی تفصیلات سے نہیں ان کے حاصلات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے پاس ایسی نگاہ عکس ریز ہوتی ہے جو ان کے حاصلات کے پس منظر میں کامیابی سے جھانک سکتی ہے اور شخصیت سے تعارف کے لیے واقعات و حقائق کی تفصیل بیان کیے بغیر اس کی کلید کو دریافت کر لیتی ہے۔ کلید کی دریافت کے بعد ضخیم مجلدات کا مضمون چند سطروں میں بیان ہو جاتا ہے۔

مختار مسعود کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ انھیں اسلوب کی وہ جادوگری عطا ہوئی تھی جس کے سامنے تفصیل نگار پانی بھرتے ہیں۔ چند جملوں میں معانی کا سمندر سمو دینا ان کی نثر کا کمال ہے اس لیے ان کے کمالات کی اندازہ گیری بھی آسان کام نہیں۔ شازیہ ظہور نے مختار مسعود کو اپنا موضوعِ تحقیق بنا کر اس مشکل کام کا چیلنج قبول کیا ہے۔ انھوں نے مختار مسعود کے سوانح کی تفصیلات جمع کی ہیں۔ قارئین کو اردو میں سوانح نگاری کے سفر سے متعارف کروایا ہے اور مختار مسعود کی نثری خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے محنت سے مختار مسعود کی غیر سوانحی تحریروں میں سے سوانحی عناصر تلاش کیے ہیں۔ مختار مسعود کی نثر کے یہ عناصر بھی دو مختلف دھاروں میں بہتے ہیں۔ پہلا دھارا ان کے ذاتی احوال کی تفصیلات کا ہے جسے شازیہ ظہور نے ان کی ''خود نوشت نگاری'' قرار دیا ہے اور دوسرا ان کے ہاں موضوعِ سخن بننے والی شخصیات کا ہے۔ بعض لوگ عمر بھر کچھ اصنافِ سخن میں قلم فرسائی کے باوجود اس صنف کے ماہر تسلیم نہیں کیے جاتے، یہاں صورتِ

حال یہ ہے کہ مختار مسعود نے جس صنف کو اپنا میدان نہیں بنایا اس میں بھی ان کے کمالات لائق اعتراف سمجھے گئے ہیں۔ اگر کوئی قاری، مختار مسعود کی طرف سے یہ موقف اختیار کرے کہ انھوں نے کبھی سوانح نگاری نہیں کی تو بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے یادگار چھوڑے ہیں اور بعض اوقات خاکہ، سوانح سے زیادہ بلاغت کے ساتھ شخصیت سے متعارف کروانے کا باعث بن جاتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ اس میں فضل الرحمن کے خاکے کی طرح سوانحی تفصیلات بھی در آئی ہوں۔ مختار مسعود کے پر اثر اور پر بہار اسلوب کا یہ جائزہ ہمیں اپنی اس تہذیبی روایت سے جوڑ دیتا ہے۔ مختار مسعود جس کے آخری علمبرداروں میں سے تھے۔

بتاریخ: ۲۹رمئی ۲۰۲۱ء

پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر
ڈائریکٹر
ادارۂ زبان وادبیات اردو
پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

نئے پہلو کی بازیافت

مختار مسعود ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کی چار تصانیف جو منظر عام پر آئیں ان میں آوازِ دوست، سفر نصیب، لوحِ ایام اور حرفِ شوق ہیں اور یقین جانیے ان میں سے کوئی کتاب بھی سوانح کے موضوع پر نہیں ہے یہ کتابیں متفرق مضامین پر مشتمل ہیں جن میں سفرنامہ، رپورتاژ، یادداشتیں وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ دیگر متفرقات میں بھی جو مقالے تحریر کردہ ہیں ان میں سوانح کا کوئی موضوع نہیں، حیران کن لمحہ تھا میرے لیے جب محترمہ شازیہ ظہور کا تحقیق کردہ مقالہ ''مختار مسعود کی سوانح نگاری'' موصول ہوا گو کہ یہ مقالہ زبانی امتحان کے لیے بھیجا گیا تھا مگر اپنے موضوع کے لحاظ سے چونکا دینے والا تھا۔ خیر پہلے فہرست ابواب کی طرف گئی تو چوتھا اور پانچواں باب جس میں مختار مسعود کی سوانح نگاری کے متعلق تھا پڑھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ محترمہ نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ مختار مسعود کی تحریر کے کچھ حصوں پر سوانحی اقتباسات کا گمان ہوتا ہے انھوں نے لاشعوری طور پر شخصیات کے بیان میں سوانح کے اصولوں کو برتا ہے بالخصوص ''حرفِ شوق'' کو جزوی خودنوشت اور سوانح نگاری کا مرقع قرار دیا جا سکتا ہے. جس میں وہ اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے ہاسٹل اور طلبہ کا نقشہ جس انداز میں پیش کرتے ہیں وہ سوانح مرقع لگتا ہے سرسید اور علی گڑھ کے متعلق ان مٹ نقوش کو قلمبند کرتے ہیں جو بلاشبہ سوانح نہ ہوتے ہوئے بھی سوانح کے حصے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ''آوازِ دوست'' میں شامل محمد ابراہیم شاکیوچن کا تفصیلی ذکر بھی سوانحی رنگ لیے ہوئے ہے۔ جب کہ ''سفرِ نصیب'' میں ڈاکٹر فضل رحمان کے متعلق تحریر کو جامع سوانح کہا جا سکتا ہے۔

اپنی اس تحقیق میں محترمہ نے مختار مسعود کو حالی یا شبلی کے پائے کا سوانح نگار ثابت کرنے کی

قطعی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ادب میں بہ حیثیت سوانح نگاران کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے، بس مختار مسعود کی تحریروں میں سوانحی جھلکیوں کی نشاندہی کر کے اردو ادب کے قاری اور محققین کی توجہ اس جانب مبذول کروائی ہے. بہر حال یہ ایک دِقت طلب اور منفرد کام تھا مگر محترمہ شازیہ ظہور کے شوق اور لگن نے مختار مسعود کی تحریر کے نئے پہلو پر بحث چھیڑ دی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ مقالہ اشاعت کے بعد ادبی حلقے میں خاصی پذیرائی حاصل کرے گا۔

بتاریخ: ۲۲راگست ۲۰۲۱ء

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ
استاد شعبہ اردو
وفاقی جامعہ اردو۔ کراچی

ایک اور اہم کتاب کی اشاعت!

اردو ادب کی کہکشاں میں بہت سے شعرا اور نثر نگاروں کے نام جگ مگ کر رہے ہیں۔ جن کے شعری اور نثری فن پارے جذبات، احساسات و واقعات کی عکاسی اور شخصیات کے خاکے اُجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی کہکشاں میں وہ منفرد انداز کا نثر نگار بھی ہے، جس کا انداز بیان اور زبان سادہ ہونے کے باوجود معنویت اور اثر آفرینی میں اپنا الگ مقام رکھتا ہے۔

تقریباً ۴۵ سال پہلے کی بات ہے اس زمانے میں وزارت خارجہ اسلام آباد کے ریسرچ ڈائریکٹوریٹ سے منسلک تھا۔ احسن علی خان اس شعبہ کے ڈائریکٹر تھے۔ ادبی حلقوں میں ان کا شمار منفرد لہجے کے شاعر اور ادیبوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک منجھے ہوئے اعلیٰ اختیاراتی افسر سرکار (بیوروکریٹ) بھی تھے۔ جبکہ ان کی بیگم اختر جمال بھی ایک مشہور افسانہ نگار اور گورنمنٹ گرلز کالج اسلام آباد میں اردو کی مقبول استاد تھیں۔ احسن علی خان سے میرا تعلق نہ صرف دفتر میں ہر وقت کا ساتھ تھا بلکہ ان کے گھر پر منعقد ہونے والی نجی ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتا اور انتظام و انصرام بھی میری ذمہ داری ہوتی تھی۔ وہیں ایک گل رنگ محفل میں پہلی مرتبہ بالمشافہ مختار مسعود سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

وہ سنجیدہ ادبی گفتگو کے ماحول کو اپنے چٹکلے بازی سے خوش گوار بناتے رہے۔ چٹکلوں اور پُرلطف گفتگو کی وجہ سے اس روز کسی اور کا سکہ نہ چل سکا۔ محفل میں وہی چھائے رہے۔ یہ اتنی خوب صورت اور پر بہار محفل تھی جس کی جھلکیاں پردہ ذہین پر تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی تازہ ہیں یہ یادیں اس وقت اور بھی تازہ ہوگئیں جب ان کی سوانح کی ایک جھلک اس وقت دیکھی جب شازیہ ظہور نے ان کی طرز سوانح نگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور فن تحریر کو

تجزیہ کی کسوٹی پر پرکھا اور ان کے اسلوب سوانح نگاری کی مقبولیت کے راز کو آشکار کیا۔ اردو میں سوانح نگاری کی ابتدا تو ڈیڑھ پونے دوصدی قبل ہوگئی تھی۔ لیکن مولانا الطاف حسین حالی کی ''حیاتِ سعدی'' کو اردو کی اوّلین سوانح تسلیم کیا جاتا ہے جس نے اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد رکھ دی، جو وقت کے ساتھ بڑھتے بڑھتے اور ترقی کرتے ہوئے مختار مسعود تک پہنچی۔ اس وقت تک یہ صنف ادب معتبر ہو چکی تھی اس کے اصول و قواعد بھی وضع ہو گئے تھے۔ ان اصول و قواعد کی روشنی میں مختار مسعود کی سوانحی نگاری کو اصول تحقیق و تجزیہ پر جانچا۔ ان کا یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ صرف دقیع ہے لیکن شازیہ ظہور کی تحریر نے مختار مسعود کی نگارشات کو معتبر کر کے ان کی انفرادیت کو مزید اُجاگر کر دیا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ شازیہ ظہور ایم فل کی سند کے بعد اپنے تحقیقی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹریٹ کے لئے کام کریں اور ادب میں اعلیٰ مقام پائیں (آمین)

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ شازیہ ظہور کا مقالہ ''مختار مسعود کی سوانح نگاری'' کتابی شکل میں بقائی یونیورسٹی پریس سے شائع ہو رہا ہے۔

چانسلر میڈیکل یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر اس کا چھاپنا میرے لئے ناممکن تھا۔ ان کی اجازت ملنا بہت مشکل تھا لیکن اللہ پاک کے کرم سے چند نکات پر گفتگو اور استدلال کے بعد اجازت مل گئی۔ چانسلر صاحبہ کا کہنا تھا کہ ''ایسی اہم شخصیت پر ریسرچ مقالہ کی ہمارے ادارے سے اشاعت ہماری علم دوستی کا ثبوت ہوگی اور پریس کی توقیر کا باعث ہوگی'' میں بحیثیت ڈائریکٹر مطبوعات اور پریس شازیہ ظہور کے اس مقالہ کی اشاعت کی اجازت پر چانسلر صاحبہ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اس مقالہ کو کتابی شکل دینے اور اس کی نوک پلک درست کرنے پر محبی ذہین عالم خاں سروہا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بقائی یونیورسٹی پریس کے شعبہ برقی کتابت (Computerzation) شعبہ طباعت (Printing Section) اور شعبہ جلد سازی (Binding Section) کے

اراکین اور ذمہ داروں کا بھی دل کی گہرائی سے فرداً فرداً شکریہ کہ انہوں نے دل جمعی سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور بقائی یونیورسٹی پریس کے معیار طباعت وتزئین کو برقرار رکھا۔

۱۱ر اگست ۲۰۲۱ء

سیّد محمد ناصر علی

کراچی

''مختار مسعود کو اردو، فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی کامل دسترس تھی
چنانچہ دو انگریزی کُتب بھی ان کے ادبی سرمائے میں شامل ہیں۔

1. An Appraisal of Land Resources in West Pakistan :-

یہ اعداد و شمار اور جغرافیائی تناظر میں مغربی پاکستان کے ارضی وسائل پر لکھی جانے والی وہ رپورٹ ہے جو انہوں نے بڑی جانفشانی سے ایڈیشنل سیکرٹری منصوبہ بندی کمیشن حکومتِ پاکستان کی حیثیت سے تیار کی تھی جسے ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ پرنٹنگ پریس مغربی پاکستان نے سرکاری ضرورت کے تحت محدود تعداد میں شائع کیا تھا۔

2. Eye Witness of History :-

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے نام چوالیس اکابرین کے غیر مطبوعہ خطوط کو مختار مسعود نے (Eye Witness of History) کے نام سے مرتب کر کے اپنے ایک دقیق تعارف کے ساتھ جنوری ۱۹۶۸ء میں گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی سے شائع کروایا۔ ان خطوط کے بارے ان کا کہنا ہے:
''یہ تاریخ کے عینی شاہد ہیں۔''

کچھ کہنا ہے

مختار مسعود اپنے اسلوب اور معانی خیزی کے اعتبار سے اردو نثر کے اُن قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی تقلید کرنے میں فخر کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ان کی نگارشات میں حُب الوطنی، عمیق مطالعہ، مشاہدہ اور تاریخ سے وابستگی قابلِ رشک ہے۔ اس انفرادیت کی ایک وجہ علی گڑھ میں طالب علمی کا وہ زمانہ ہے جب تحریکِ پاکستان اپنے عروج پر تھی اور اکابرین کا جامعہ علی گڑھ میں تواتر سے آنا جانا معمول تھا۔ طلبہ ان زعما کی تقاریر اور گفتگو سے تحریک آزادی کے پُر جوش کارکن بن جاتے تھے۔

مختار مسعود نے اسی کاروانِ آزادی میں شامل ہو کر تشکیل پاکستان میں اپنے حصے کا حق ادا کیا اور بعد ہجرت اس سرزمین پاک کو اپنا مسکن عزیز بنایا۔ عملی زندگی کا آغاز سول سروس سے کیا اُن کا شمار وطن عزیز کے ان چند افسران میں ہوتا ہے نیک نامی جن کا مقدر رہوئی۔ وفاقی رصوبائی اور نیم سرکاری اداروں میں اہم مناصب پر فائز رہے اور وفاقی سیکرٹری کے منصب سے سبکدوش ہوئے۔ مختار مسعود نے علمی، ادبی، تعلیمی، سماجی تنظیموں اور قرطاس وقلم سے اپنی وابستگی آخری سانس تک قائم رکھی۔

موضوع ''مختار مسعود کی سوانح نگاری'' جو اوّل اوّل تو مجھے ناقابلِ تسخیر معرکہ نظر آتا تھا۔ کئی احباب نے واپسی کے لیے راہ دکھائی اور کچھ نے اس پر استقامت کو میرا دماغی خلل قرار دیا۔ ایسے میں میری مشفق استاد پروفیسر ڈاکٹر راحت افشاں خضرِ راہ بنیں۔ یہ ڈاکٹر صاحبہ کا ہی اعجاز ہے کہ میں ''مختار مسعود'' جیسے بلند پایہ نثر نگار کی ایک نئی جہت سے اردو ادب کے دبستان نثر کو متعارف کروانے میں کامیاب ہو سکی ہوں۔ اس علمی سفر میں پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی مخصوص

میٹھی میٹھی ڈانٹ ڈپٹ کا ''تڑکا'' بھی میری چارہ گری کرتا رہا۔ انہوں نے مقالہ کو سندی نہیں بلکہ افادی بنانے کے لیے جزئیات وکلیات کو جس طرح آسان کیا وہ ڈاکٹر صاحب کا وصفِ رہبری ہے۔ تکمیل مقالہ کے سلسلے میں میرے اساتذہ نے جس طرح قدم قدم پر میری رہنمائی اور علمی وسائل کی دستیابی کے لیے راہ کی دشواریوں کو آسان کیا اس کے لئے مجسم سپاس ہوں۔

ممتاز محقق، استاد اور ڈائریکٹر ادارۂ زبان و ادبیاتِ اردو، جامعہ پنجاب پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر، میرے وہ مربی ہیں جن کی شکر گزاری کے لیے کوئی ایسا موزوں لفظ میری دسترس میں نہیں جو کما حقہ ان کی شفقت و عنایت کا حق ادا کر سکے انہوں نے جس خندہ پیشانی سے میری طفلانہ باتوں، سوالوں پر توجہ دی اور ماخذات فراہم کیے وہ صرف ان جیسا عظیم انسان اور بے مثال استاد ہی کر سکتا ہے۔

مختار مسعود کے صاحبزادگان سہیل مسعود، سلمان مسعود، ممتاز محقق سید عقیل عباس جعفری، محمد معراج جامی، پروفیسر ڈاکٹر الطاف یوسف زئی (شعبہ اردو مانسہرہ یونی ورسٹی)، امر شاہد، استاد الاساتذہ پروفیسر محمد سلیم اقبال صدر شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف (S.A.L) گورنمنٹ ڈگری بوائز کالج میر پور خاص میرے مخلص و شفیق اساتذہ میں سر فہرست ہیں جن کی رہنمائی کے سبب نا صرف میں سندھ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہو کر لیکچرار بن سکی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کے طفیل ایم فل کی سند کا حصول بھی ممکن ہوا، پروفیسر نوید السلام المعروف نوید سروش، پروفیسر قاسم علی، سید وقار زیدی، ریسرچ اسکالر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی محمد شمشیر، حافظ عطاء الرحمٰن سمیت تمام ہم جماعتوں جنھوں نے ہمہ وقت دستِ تعاون دراز رکھا اس کے لیے میں ان سب کی ممنون ہوں۔

والدہ ہاجرہ بیگم نے جس طرح مجھے اپنی دعاؤں کی چھاؤں میں رکھا اور میرے برادر کبیر و صغیر فیض اللہ، خرم ظہور اور میری بہنوں نے میرے علمی و تحقیقی کام میں جو حوصلہ افزائی کی یہ اسی کا ثمر ہے کہ میں مقالہ مکمل کر سکی اللہ تعالیٰ انھیں شاد و آباد رکھے۔ آمین

جن کی آنکھوں میں خواب سجے تھے کہ اعلیٰ تعلیم ، بلند مرتبہ اور روشن مستقبل میرا مقدر ہو، وہ تو جنت میں اتنی جلد جا بسے کہ میں تعبیر پانے کے باوجود بھی ان کے دست شفقت کا لمس کشید کرنے سے محروم ہوں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی پکار ''میرا بیٹا'' آج بھی میری سماعتوں میں محفوظ ہے جو ہمہ وقت میرے قدموں میں استقامت، ارادوں کو پروازِ شاہین کا ولولہ اور روح کو سرسبز و شاداب رکھتی ہے۔ میرے قائد و رہبر، میرے ابوظہور الدین نے میری انگلی پکڑ کر مجھے جس راہ پر ڈالا تھا آج ان کی یاد...... ! سفر کے اس اہم پڑاؤ پر تشکر کے آنسو بن کر میری آنکھوں میں تیرتے ہیں، ہر کامیابی کی طرح میری یہ کامیابی بھی انہی سے پیوستہ ہے۔

آخری حروف اپنے مخلص دوست ، رہبر علمی و ادبی ڈاکٹر عرفان شاہ ،صدر شعبہ اردو سراج الدولہ گورنمنٹ ڈگری کالج نمبر ا، ایف سی ایریا کراچی کے نام جس کے بعد قلم کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں عجب شخص ہے اس طرح قدم قدم حائل الجھنوں اور علمی نکات کو سلجھاتا رہا کہ پتہ بھی نہ چلا اور میرا مقالہ مکمل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ میرے مرشدِ روحانی و علمی پر ہمیشہ اپنا فضل و کرم رکھے اور حاسدوں سے بچائے۔ آمین

شازیہ ظہور

''ناقدین نے سوانح نگاروں کے بارے میں اپنی تنقیدی آرا کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا ہے۔ مختلف سوانح نگاروں کے موضوعات کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سوانح نگاروں نے اپنے اسلوب، سوچ وفکر، ذہنی اپچ اور پسند وناپسند کے لحاظ سے الگ راہیں نکالی ہیں۔ جن کی بدولت جہاں بعض شخصیتوں کی حیات وخدمات کے مخفی پہلو بھی سامنے آتے ہیں، وہاں ان کے ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک مکمل اور بھرپور تاثر آئینہ ہو جاتا ہے۔ سوانح نگاری میں مشاہدہ، حقیقت اور اسلوب کی شگفتگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ساتھ ہی مردم شناسی کا جوہر اور نفسیاتی آگاہی کو ایک اچھے سوانح نگار کی بنیادی خوبی مانا جاتا ہے۔''

سوانح و شخصیت

اردو ادب میں پچھلے ساٹھ سال سے جن شخصیات نے اپنے فن اور اس کے اظہار کے منفرد انداز کی بنا پر الگ راہ کا سفر کیا ان میں صورتِ ماہتاب روشن مختار مسعود ہوئے۔ انہوں نے نثری ادب میں ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے جو تجربات کیے وہ اپنی مابعد الطبیعات میں سماج کے گہرے تجزیے، مطالعے اور ثقافتی اقدار کی ان بنیادوں سے قاری کو آشنا کرتے ہیں جو اس سے قبل اردو کے نثری ادب میں کبھی قابل توجہ نہیں رہے۔

اردو کے نثری ادب میں ایسے اہل قلم کم نہیں جن کی تخلیقات کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ اگر عصر حاضر میں صنفِ مزاح کی بات کریں تو مشتاق احمد یوسفی کا ہم سر کوئی نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اردو انشائیہ میں اگر کسی کی انفرادیت مسلّمہ ہے تو وہ مختار مسعود کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں، ان کا تصنیفی سرمایہ گرچہ قلیل ہے مگر پروازِ تخیل بلند تر اور گہرائی و گیرائی، ناقدین کو نقد و نظر کی کھلی دعوت دیتی ہے۔ ان کا بیانیہ رواں دواں سہل اور دلنشین ہے۔ عبارت اتنی سلیس اور سادہ کہ پڑھنے میں سبک رو، اور مشکل اتنی کہ اس طرز میں قلم آزمائی کرنا چاہیں تو بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ نازک سے نازک نکتہ ہو یا لطیف احساس، عبارت کی سادگی میں فرق نہیں آتا اور معنی آفرینی کا حق بھی پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔

مختار مسعود کو اختصار پر ملکہ حاصل ہے۔ ان کے اسلوب کی یہ خاص انفرادیت ہے کہ ہر جملہ مفصّل بات اور منظر پیش کرتا ہے۔ ان کے ہاں جہاں تک الفاظ کی برمحل نشست اور ابلاغ کی بے نظیر صلاحیت کا معاملہ ہے اپنے طرزِ انشا کے نابغہ موجد اور خاتم بھی ہیں۔ اسی وصف سے ان کو اردو کے نثری ادب میں نابغۂ روزگار کا درجہ حاصل ہے۔

مختار مسعود کی نگارشات کی خاص علمی اُپج، روشن فکر اور دل پزیری قاری کی روح میں نفوذ کرتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں تاریخ، فلسفہ، مشاہدہ، انقلاب کے مضمرات کا تجزیہ اور وطنیت واضح الفاظ میں پاکستانیت کی قندیلیں روشن ہیں۔

یہ مقالہ ان کے بیانیے میں موجود تہہ داری، پہلو داری اور معنویت کے ہر زاویے کو اُجاگر کرنے کی ایک علمی سعی ہے تاکہ ان کے افکار و آثار کے ادبی مقام کا تعین کیا جا سکے۔

میں نے اپنے تحقیقی کام کو مختار مسعود کی سوانح نگاری کے تنقیدی جائزے تک محدود رکھا ہے۔ تاکہ ناقدین کماحقہ طور پر اردو نثری ادب میں مختار مسعود کی سوانح نگاری کے اسلوب سے مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے مقام کا تعین کر سکیں۔

(الف) حالاتِ زندگی

مختار مسعود کے اجداد کشمیر النسل تھے، ہجرت کر کے پنجاب کے ضلع گجرات کے قصبہ جلال پور جٹاں میں مقیم ہوئے۔ ان کے دادا وثیقہ نویس امیر بخش، شیخ برادری سے تعلق رکھتے تھے، انہیں عربی، فارسی، پنجابی اور اردو زبانوں پر کامل قدرت تھی۔ ان کی شریکِ حیات بیگم بی بی کے بطن سے پانچ بیٹے، برکت علی، محمد رمضان، شیخ عطا اللہ، محمد اقبال، آفتاب احمد اور دو بیٹیاں برکت بی بی اور تاج بیگم پیدا ہوئیں۔ امیر بخش کافی عرصے کسبِ معاش کے لیے گجرات میں مقیم رہے ان کے بیٹوں میں شیخ عطا اللہ علم کے شیدائی تھے۔

شیخ عطا اللہ ۱۸۹۶ء [۱] جلال پور جٹاں [۲] میں پیدا ہوئے۔ ناظرہ اور ابتدائی تعلیم و تربیت گھر کے ماحول میں حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول گجرات سے میٹرک، دیال سنگھ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں اس زمانے کی روایت کے مطابق اوائل جوانی میں شیخ عطا اللہ کو منشی برکت علی کی صاحبزادی شاہ بیگم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔ شیخ عطا اللہ نے شادی کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، ۱۹۲۴ء میں ایم اے (معاشیات) اسلامیہ کالج لاہور

سے کیا۳۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز، مرے کالج سیالکوٹ سے بہ حیثیت لیکچرر کیا۴۔ جہاں انھوں نے پانچ سال درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۹ء میں برصغیر کی ممتاز مادرِ علمی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں معاشیات کے پروفیسر کی حیثیت سے منسلک ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۵۔ پروفیسر شیخ عطاءاللہ کی اردو، انگریزی، عربی اور فارسی پردسترس قابل رشک تھی۔ وسیع مطالعہ مدون اور مترجم ان کا گراں قدر علمی ورثہ کچھ یوں ہے۔

۱۔ ''پنجاب کی معیشت اور امدادِ باہمی'' (انگریزی) ۱۹۳۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۶

۲۔ ''آئین صحت'' (۱۹۳۶ء)

۳۔ Co-Operative Movement India (۱۹۳۷ء)

۴۔ Oriental Encounter، مصنف محمد مارماڈیوک پکتھال (اسلامی ثقافت پر تقریریں) کا ترجمہ۷

۵۔ ''فلسطین کی تحریک'' (انگریزی سے اردو میں ترجمہ) ۸

۶۔ ''خطوطِ اورنگزیب'' (فارسی سے اردو میں ترجمہ) ۹

۷۔ ''اقبال نامہ'' (خطوطِ اقبال) دو جلدیں ۱۹۴۴ء ، ۱۹۵۱ء

شیخ عطاءاللہ کا شمار اقبال کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے اور ''اقبال نامہ'' اقبال سے ان کی بے لوث محبت کا ثبوت ہے جسے انہوں نے بڑی جاں فشانی سے ترتیب دیا۔

پروفیسر شیخ عطاءاللہ ۱۹ سال علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں پروفیسر رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے اور ''ہیلی کالج آف کامرس'' (لاہور) سے منسلک ہوئے۱۰ ۱۹۵۴ء میں سبکدوشی کے بعد چنیوٹ میں اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی اور پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، ان کی اہلیہ شاہ بیگم ۱۹۶۶ء میں دنیا سے رخصت ہوئیں اور لاہور میں حضرت میاں میر کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں ان سے شیخ عطاءاللہ کی چار اولادیں پیدا ہوئیں تین بیٹے مختار محمود، مختار مسعود، جاوید مسعود اور ایک بیٹی تنویر اختر۔ شیخ عطاءاللہ گردے کی تکلیف میں مبتلا

رہنے کے باعث، ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء [11] کو لاہور میں خالق حقیقی سے جا ملے، ان کی خواہش کے مطابق مرنے کے بعد ان کی قبر غازی علم الدین شہید کے مزار کے قرب میں بنائی گئی [12]

پاکستان کا مردم خیز شہر سیالکوٹ جو اردو ادب کی نا قابل تسخیر مثلث اقبال، فیض اور مختار مسعود کی جائے پیدائش ہے۔ مختار مسعود نے ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو اسی شہر کے باسی ماہر معاشیات شیخ عطاءاللہ کے گھر جنم لیا [13] مختار مسعود نے دینی اور ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پانچ برس کی عمر میں ۱۹۳۲ء میں [14] ان کے والدین نے انھیں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اسکول میں پہلی جماعت میں داخل کروایا۔ مختار مسعود نے اپنے تعلیمی مدارج درجہ بہ درجہ امتیازی نمبروں سے طے کرتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ایم اے (معاشیات) کی سند حاصل کی اس سولہ سالہ تعلیمی میدان میں انہوں نے نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن میں تقریری مقابلے، گھڑ سواری، اور تیراکی میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔

دورِ طالب علمی میں مختار مسعود کی شخصیت اور مشاغل کے بارے میں اُن کے ہم جامعہ ڈاکٹر نسیم انصاری کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''ہمارا تعلق تو رائیڈنگ کلب، سوئمنگ باتھ، اسکیٹنگ رنگ، بوائے اسکاؤٹس، اسکول کے ڈراموں اور مشاعروں سے تھا، ناولوں کا بھی شوق تھا اور سینما کا بھی۔'' [15]

تحریکِ پاکستان میں بہ حیثیت طالب علم حصہ لیا اور یونی ورسٹی سے نکلنے والے جریدے ''بیداری'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ علی گڑھ کو ان کی یادوں میں حسین محبوبہ کا درجہ حاصل رہا جس کا ذکر انھوں نے ہر بار سرشاری کے ساتھ کیا۔ مادرِ علمی میں انھیں رشید احمد صدیقی جیسے اساتذہ کا فیض حاصل رہا جس پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے۔

> ''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ تمھارے زمانے کے علی گڑھ نے اردو نثر کو کیا دیا تو میں بے تکلف دو نام لوں گا رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی۔'' [16]

مختار مسعود نے ۱۹۴۸ء میں اپنے والدین کے ہمراہ علی گڑھ سے پاکستان ہجرت کی اور کچھ عرصہ کراچی میں اکنامکس انوسٹی گیٹر کے طور پر اکنامک آفیسر ڈویژن میں کام کیا۔ ۱۹۴۹ء میں مقابلے کے امتحان میں شرکت کی اور کامیاب رہے انھیں پاکستان کے کم عمر ترین سول سرونٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے [۱۷]۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ۲۲ سال کی عمر میں سول سروس کا باقاعدہ آغاز کیا [۱۸]۔ آپ بہ حیثیت اسسٹنٹ کمشنر (خوشاب) میں تعینات ہوئے۔

نوزائیدہ مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان کی تعمیر میں لائق اور محبِ وطن بیوروکریٹ کا کردار انتہائی اہم تھا جنھوں نے اپنی بہترین صلاحتیں ملک کی خدمت میں صرف کیں۔ سول سروس آف پاکستان (سی ایس پی) کے لیے ۴۹۔۱۹۴۸ء میں پہلا چناؤ کیا گیا ان میں مختار مسعود بھی شامل تھے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ منتخب افراد میں سے چند بعد ازاں سیاست اور شعر و ادب کی نابغہ شخصیات ہوئیں۔ سول سروس اکیڈمی لاہور میں مختار مسعود کے ہم عصروں میں شان الحق حقی، آفتاب احمد خان، دربار علی شاہ روائید خان، الطاف گوہر اور بلخ شیر مزاری شامل تھے [۱۹]

مختار مسعود ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۶ء میں وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان کی شریکِ حیات عذرا مسعود کراچی کی رہائشی تھیں۔ شادی سے پہلے عذرا سلطانہ کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ ان کے والد میاں سعید احمد اور والدہ مجیدہ سلطانہ کا تعلق کشمیر (سری نگر) سے تھا۔ ان کے والد محکمہ جنگلات میں ملازم تھے۔ عذرا مسعود کی پیدائش ۲۰ر جولائی ۱۹۳۳ء لاہور اپنے ننھیال میں ہوئی۔ آپ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں آپ سے چھوٹی دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ عذرا مسعود نے ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر حاصل کی، پرائمری تعلیم ہندوستان کے ضلع (نارائن گڑھ) سے حاصل کی۔ میٹرک ضلع انبالہ سے کیا۔ ایف اے کراچی کے سینٹ جوزف کالج سے کیا اور بی اے کی سند بھی اسی کالج سے حاصل کی۔ ایم اے سائیکالوجی کی سند امتیازی نمبروں سے جامعہ کراچی سے حاصل کرنے کے بعد آپ نے لندن کے تعلیمی ادارے ''مینٹلی ریٹارڈ چلڈرن'' میں داخلہ لیا۔ اس ادارے کے اسپتال کا نام ''ٹوئنگ گرو'' تھا۔ یہ تین

سالہ ڈگری کورس دماغی امراض والے بچوں کا علاج اوران کی تربیت کرنے کے حوالے سے تھا۔ اس کورس کو کرنے کے بعد کسی بھی اسپتال میں بچوں کے سیکشن میں کام کیا جا سکتا ہے۔

عذرا مسعود کا ارادہ اس کورس کی تکمیل کے بعد اپنی چھوٹی بہن ڈاکٹر عفت آرا کے ساتھ مل کر ایک کلینک کھولنا تھا لیکن افسوس یہ کورس تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ والدہ کی شدید علالت اور ان کی تیمارداری کے جذبے نے انہیں وطن واپسی پہ مجبور کر دیا۔ وہ والدہ کی دیکھ بھال میں شب و روز مصروف رہیں۔ اس سے قبل کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے واپس انگلستان جاتیں قسمت نے انہیں مختار مسعود سے رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ عذرا مسعود تعلیم یافتہ، روشن خیال ہونے کے باوجود خالصتاً وفا شعار مشرقی بیوی بن کر رہیں اور اس پر انہوں نے فخر بھی کیا۔ مختار مسعود کی کامیابیوں میں بنیادی حیثیت پر سکون گھریلو زندگی کی ہے۔ جو فقط عذرا مسعود کے ایثار و قربانی کے سبب انہیں میسر آئی۔ اولاد کی تعلیم و تربیت سے لے کر خاندانی مسائل اور ان کے حل تک، کوئی پریشان کن خبر یا فکر، ہر معاملے سے انھوں نے مختار مسعود کو حتی الامکان دور رکھا۔ ان کی رضا کو اپنی رضا جانا۔ میں بیگم مختار مسعود کے بارے میں ابھی بہت کچھ ضبط تحریر کرنا چاہتی تھی کہ یہ افسوس ناک خبر ان کے صاحبزادے سلمان مسعود سے ملی کہ اماں شادمان ٹاؤن (لاہور) کے شہر خموشاں میں ۷رمئی ۲۰۲۰ء بروز جمعرات ابا کی قربت میں جا بسی ہیں۔

عذرا مسعود کو بھی ادب سے لگاؤ تھا۔ ازدواجی زندگی کی مصروفیت کے باوجود انہوں نے کتاب ''داستانِ قرآن'' کی تالیف و تلخیص کی۔ اس میں انبیا علیہم السلام کی داستانیں رقم ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۱۷ء میں الدائم پبلی کیشن، لاہور سے شائع ہوئی۔

مختار مسعود اور عذرا مسعود کو خدا تعالیٰ نے تین اولادوں یعنی دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔ بڑے بیٹے سہیل مسعود ۲۵ رنومبر ۱۹۵۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے رومانیہ سے MSc، ڈینور یونی ورسٹی (کولوراڈو) امریکہ سے MBA اور پھر فنانس میں اسپیشلائز کیا اور

۱۳ر نومبر ۱۹۹۰ء میں نوشین نشاط احمد سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ آج کل سعودی عرب (ریاض) میں بینکر ہیں اور دو بچوں ایک بیٹا اور ایک بیٹی کے باپ ہیں۔

مختار مسعود کے چھوٹے بیٹے سلمان مسعود ۱۰ر جون ۱۹۶۳ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی قابلیت کیمیکل انجینئر، ڈینور یونی ورسٹی سے MBA، شادی ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۵ء میں منزہ آصف بخش سے لاہور میں ہوئی۔ ملازمت لاہور شہر میں ہے اور رہائش سیالکوٹ میں۔ ان کی دو اولادیں یعنی دو بیٹے ہیں جو فی الحال آسٹریلیا میں پڑھائی کے لیے مقیم ہیں۔

مختار مسعود کی بیٹی عالیہ مسعود کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر ہیں اور ایک اسکول میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ان کے شوہر امتیاز بخاری بینکر ہیں یہ گھرانا بھی لاہور شہر میں مقیم ہے۔

مختار مسعود اپنے والد صاحب سے بہت متاثر تھے۔ ان کی پسندیدہ شخصیت ان کے والد صاحب ہی تھے۔ مختار مسعود نے اپنا آبائی گھر جو جلال پور جٹاں (گجرات) میں تھا، کو فروخت کرنے کے بجائے اسے تعلیم و تدریس کے لیے وقف کر دیا ۲۰۔ ان کے حلقۂ احباب کے ممتاز افراد میں محمد طفیل، مشتاق احمد یوسفی، شیخ منظور الٰہی، ابنِ حسن برنی، سید ضمیر جعفری اور عبدالعزیز خالد شامل ہیں۔

مختار مسعود ملازمت کے ابتدائی دس سال اسسٹنٹ کمشنر خوشاب۔ ڈپٹی کمشنر ملتان، کراچی اور بہاولپور تعینات رہے۔ کمشنر (لاہور) کی حیثیت سے انھوں نے مینارِ پاکستان کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی۔

انھوں نے درج ذیل وزارتوں اور محکموں میں بہ حیثیت سیکریٹری بھی فرائض انجام دیے:

۱۔ وفاقی وزارتِ اطلاعات و نشریات
۲۔ وفاقی وزارتِ پٹرولیم و قدرتی وسائل
۳۔ وفاقی وزارتِ محکمہ بلدیات
۴۔ وفاقی وزارتِ خزانہ

۵۔ وفاقی وزارتِ خوراک

۶۔ وفاقی وزارتِ تجارت

۷۔ وفاقی صحت وسماجی بہبود

۸۔ وفاقی منصوبہ بندی کمیشن

۹۔ سیکرٹری جنرل (آرسی ڈی) ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء۔ چار سال ایران کے شہر تہران میں مقیم رہے جہاں انہوں نے انقلابِ ایران کی تاریخ رقم کی۔

نیم سرکاری وخود مختار اداروں سے وابستگی:

۱۔ پاکستان انڈسٹریل بینک

۲۔ عالمی بینک

۳۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارہ

۴۔ اسلامی ترقیاتی بینک

۵۔ اقبال اکادمی (لاہور)

۶۔ زرعی ترقیاتی بینک آف پاکستان

۷۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

۸۔ ایگری کلچر ڈیولپمنٹ بینک آف پاکستان (اے ڈی بی پی)

۹۔ پاکستان واٹر اینڈ پاور ڈولپمنٹ اتھارٹی (واپڈا)

۱۰۔ قومی نجکاری کمیشن

مختار مسعود ۱۹۸۷ء میں کارِ سرکار کے منصب سے ۶۰ سال کی عمر میں سبکدوش ہوئے اس وقت وہ سیکرٹری کامرس اسلام آباد تھے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے ۳۸ سال انتہائی کامیابی کے ساتھ گزارے۔

(ب) مختار مسعود اور سماجیات

مختار مسعود کارِ سرکار کے ساتھ ہمیشہ تدریسی، تعلیمی، علمی، ادبی اور سماجی اداروں سے عملاً منسلک رہے اور یہ تعلق سرکارِ منصبی سے سبکدوشی کے بعد تادمِ آخر قائم رہا۔ اگرچہ بڑھتی عمر کے ساتھ ان کی سماجی زندگی انتہائی مختصر دائرے میں مقید ہوگئی تھی اس کے باوجود ان کے علم و فضل سے استفادہ کرنے کے لیے احباب ''العطا'' پر حاضر ہوتے اور فیضیاب ہوکر جاتے۔ جن اداروں سے مختار مسعود کی وابستگی رہی وہ درج ذیل ہیں [۲۱]

تدریسی و تعلیمی ادارے :

۱۔ پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج لاہور (پرنسپل)
۲۔ پنجاب یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز
۳۔ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور
۴۔ ایچی سن کالج لاہور
۵۔ پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن
۶۔ نظریہ نصابِ تعلیم کمیٹی
۷۔ پنجاب پبلک لائبریری
۸۔ کمیشن برائے جامعہ خواتین لاہور
۹۔ پنجاب ایگزامینیشن اتھارٹی

علمی و ادبی ادارے:

۱۔ پاکستان ہسٹاریکل ریسرچ سوسائٹی

۲۔ رائٹرز گلڈ ملتان / بہاولپور

۳۔ ادارۂ مصنفین ملتان / بہاولپور

۴۔ فکرو فن ملتان

۵۔ عالمی ادارہ اشاعتِ علوم اسلامیہ ملتان / بہاولپور

۶۔ ایوان ادب ملتان

سماجی ثقافتی اور معاشی ادارے:

۱۔ پاک امریکن مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ لاہور

۲۔ نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن لاہور

۳۔ بابِ پاکستان نیشنل میموریل کونسل لاہور

۴۔ کمیٹی برائے اسلامی رفاہی مملکت

۵۔ قومی مالیاتی کمیشن

۶۔ قومی نج کاری کمیشن

۷۔ صوبائی جشن گولڈن جوبلی کمیشن

۸۔ کمیٹی برائے اسلامی اقتصاد

(ج) بازیافتِ مسعود

مختار مسعود کی نثر اپنے منفرد اسلوب، رواں بیانیہ اور زندگی کے حقائق سے بھرپور کاٹ دار جملوں کے سبب اردو ادب میں ایک مستقل دبستان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جس کے مختلف پہلوؤں کی بازیافت کے لیے مختار مسعود کے فکروفن پر درس گاہوں میں کیا جانے والا اعلیٰ تحقیقی کام اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ان کی نثر اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔

	موضوع	(درجہ)	محقق	نگراں	کیفیت	درس گاہ
ا۔	مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود کے اسلوب کا تقابلی جائزہ	پی ایچ ڈی	الطاف یوسف زئی	ڈاکٹر روبینہ شاہین	تکمیل ۲۰۱۰ء	پشاور یونی ورسٹی
۲۔	مختار مسعود حیات اور ادبی خدمات	پی ایچ ڈی	خرم ورک	ڈاکٹر زاہد منیر عامر	زیرِ تکمیل	جامعہ پنجاب
۳۔	مختار مسعود کی تحریروں میں علی گڑھ اور سر سیّد بطور موضوع	پی ایچ ڈی	صدیق اقبال	ڈاکٹر الطاف یوسف زئی	زیرِ تکمیل	ہزارہ یونی ورسٹی
۴۔	مختار مسعود کی ادبی خدمات	ایم فل	مظفر حسین	ڈاکٹر صلاح الدین درویش	تکمیل ۲۰۱۰ء	علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی

(اس مقالہ کے اولین نگراہ پروفیسر ڈاکٹر صابر کلوروی تھے، ان کے وصال کے بعد اس کی تکمیل ڈاکٹر صلاح الدین درویش نے کرائی)

	موضوع	(درجہ)	محقق	نگراں	کیفیت	درس گاہ
۵۔	مختار مسعود بطورِ خاکہ نگار	ایم فل	احسن	ڈاکٹر الطاف یوسف زئی	تکمیل ۲۰۱۸ء	ہزارہ یونی ورسٹی
۶۔	آوازِ دوست حواشی وتعلیقات	ایم فل	محمد شمشیر	ڈاکٹر عبدالستار ملک	تکمیل ۲۰۱۹ء	علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی
۷۔	فرہنگِ مختار مسعود	ایم فل	اسما یوسف	ڈاکٹر الطاف یوسف زئی	زیرِ تکمیل	ہزارہ یونی ورسٹی

۸۔	مختار مسعود شخصیت و فن	ایم اے	طاہرہ پروین	-----	تکمیل ۱۹۹۱ء	اورینٹل کالج لاہور
۹۔	آوازِ دوست کا تنقیدی جائزہ	ایم اے	احمد حسین خٹک	-----	تکمیل ۲۰۰۶ء	جامعہ پشاور

(و) اعزازات

مختار مسعود اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جہاں ستائشِ باہمی کی بنیاد پر قد آور ہونا جرم تھا اس لیے بے وقعت اعزازات کا بوجھ اٹھانے کی مشقت سے اپنے آپ کو کمالِ مہارت سے محفوظ رکھا۔
ایک سرکاری اور ایک بین الاقوامی غیر سرکاری اعزاز انہوں نے قبول کیا۔

ستارۂ امتیاز:

حکومتِ پاکستان نے علم و ادب کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۳ء میں عطا کیا[۲۲]

عالمی فروغ اردو ایوارڈ:

دنیائے اردو میں مجلسِ فروغِ اردو ادب دوحہ/قطر کو اپنی غیر جانبداری، علم پروری کی وجہ سے اعتبار کی سند حاصل ہے اس بین الاقوامی ایوارڈ [۲۳] کا اجرا ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی ایما پر ہوا، اس سلسلے کا چوتھا ایوارڈ ۱۹۹۹ء مختار مسعود کو دیا گیا [۲۴]

(ہ) ایامِ علالت

مختار مسعود نے کارِ سرکار سے سبکدوشی کے بعد تیس سال تک بڑی منظم زندگی گزاری لیکن فطرت

کے اپنے اصول ہیں۔ صبح خیز مختار مسعود نماز مسجد میں پڑھنے اور چہل قدمی کے عادی تھے لیکن عمر عزیز کے آخری عشرے میں انہیں کئی عوارض لاحق ہوئے لیکن بلند حوصلہ مختار مسعود نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے ان کا مقابلہ کیا اور تخلیق کا عمل اور روز کے معمولات کو حتی الامکان جاری رکھا۔ شوگر، بلڈ پریشر (بلند فشارِ خون) بینائی اور چند ایسے پیچیدہ امراض میں مبتلا ہوئے جن سے صرف ان کے اہل خانہ ہی واقف تھے اس بارے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر لکھتے ہیں:

''سلمان صاحب نے مختار مسعود صاحب کی صحت کے بعض کوائف بتائے جو پریشان کن تھے۔'' ۲۵

صحت تیزی سے نحیف وضعف کی طرف مائل تھی۔ زندگی خواب گاہ میں گزرنے لگی۔ البتہ بکھرے ہوئے علمی کام کو سمیٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ بینائی اور کمزوری کے سبب چہل قدمی موقوف کردی تھی اس بارے میں مختار مسعود نے بتایا:

''تین چار مرتبہ میں گھر میں اور گھر سے باہر گر گیا جس پر مجھے بعض خیر خواہوں نے سیر ترک کرنے کا مشورہ دیا اور پھر میں نے سیر کرنا چھوڑ دیا۔'' ۲۶

ضعف کے باعث اسّی ۸۰ سال تک پابندی سے مسجد جانے والے مختار مسعود صرف جمعہ کی ادائیگی تک محدود ہو گئے اس بارے میں عذرا مسعود کا کہنا ہے کہ:

''جمعہ کے دن دو آدمی انہیں سہارا دے کر مسجد لے جایا کرتے۔'' ۲۷

اخبار بینی اور خط و کتابت ان کا خاص شغف تھا لیکن بینائی کچھ ایسی متاثر ہوئی کہ اخبار بینی تقریباً ختم ہوگئی۔ اس بارے میں مختار مسعود نے ڈاکٹر زاہد منیر عامر کو بتایا:

''اخبار دیکھا کرتا تھا وہ سرخیوں تک رہ گیا ہے، اب دو برس سے ڈاک بھی نہیں دیکھتا جو خط آتا ہے میں کہتا ہوں رکھ دو، کھول کر نہیں دیکھتا۔'' ۲۸

اس صورتِ حال سے واضح ہوتا ہے کہ مختار مسعود جن عوارض کا شکار تھے اُنہوں نے اُنھیں

کچھ ایسا صاحب فراش کیا کہ وہ اپنی خواب گاہ تک محدود زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ مختار مسعود کی علالت کا ایک سبب تنہائی بھی تھا۔ ان کا ایک بیٹا ملک سے باہر اور دوسرا شہر سے باہر رہائش رکھتا ہے۔ بیٹی اپنے گھر کی ہے۔

سچ ہی ہے کہ مختار مسعود نے پیرانہ سالی، ضعف و نقاہت اور آزارِ تنہائی کے باوجود کمالِ حوصلہ مندی سے عوارض کا مقابلہ کیا اور کبھی انہیں اپنے اعصاب پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

(و) وفات و تدفین

اوائل اپریل ۲۰۱۷ء سے مختار مسعود کی صحت تیزی سے گرنی شروع ہوئی۔ نقاہت بڑھنے کے ساتھ ہی نظامِ تنفس کی روانی میں بھی اکثر خلل واقع ہونے لگا تھا۔ جمعتہ المبارک ۱۴ر اپریل ۲۰۱۷ء کو رات ساڑھے دس بجے انہیں سینے میں درد اور سانس لینے میں دشواری کے باعث پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی لایا گیا [۲۹] جہاں انتہائی نگہداشت کے شعبے کے ماہر معالجین، ادب کے نباض کی ڈوبتی نبض کو بحال کرنے کے لیے سرگرم تھے اور باہر اہلِ خانہ دُعا گو۔ آسمانِ رحمت سے بلاوا آ چکا تھا۔ مشیتِ ایزدی کے سامنے تدبیر سرنگوں تھی۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہوا اور روح نوے ۹۰ سالہ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، ''آوازِ دوست'' کا نقیب اور ''حرفِ شوق'' کا مسافر مختار مسعود راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔

بروز ہفتہ ۱۵ر اپریل ۲۰۱۷ء کو ''العطا'' کے مقابل واقع جامع مسجد شادمان (لاہور) میں بعد عشا نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد انہیں قبرستان شادمان کالونی (لاہور) میں سپردِ خاک کیا گیا۔ جنازے میں ادب دوست ادبا، شعرا، اعلیٰ سرکاری افسران اور مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے کثیر افراد شریک تھے اُس وقت کے صدرِ مملکت ممنون حسین، وزیرِ اعظم محمد نواز شریف، اور دیگر اہلِ علم و دانش نے اپنے تعزیتی پیغامات میں مختار مسعود کے وصال کو اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔

حواشی

۱۔ سید معراج جامی، علی گڑھ یونی ورسٹی کا ایک اور حقیقی سپوت بھی رخصت ہوا، مشمولہ: ماہنامہ ''پرواز'' لندن، اگست ۲۰۱۷ء، ص۴۔

۲۔ مختلف لوگوں کی رائے ہے کہ شیخ عطاالله سیالکوٹ ضلع (پنجاب) میں پیدا ہوئے جب کہ (راقمہ) کو عذرا مسعود کی جو تحریر موصول ہوئی اس سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کی پیدائش جلال پور جٹاں کی ہے۔

۳۔ مظفر حسین، مختار مسعود کی ادبی خدمات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی ۲۰۱۰ء، ص۹۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ''لوحِ ایام'' پر نقش ''آوازِ دوست'' کا ''سفر نصیب'' ہوا، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، امر شاہد (مرتب)، ص۱۰۹۔

۶۔ فیصل احمد نقش، مختار مسعود ایک نظر میں، مشمولہ: ماہنامہ 'قومی زبان'، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، مئی ۲۰۱۷ء، ص۸۳۔

۷۔ عالم نقوی، خاک قبرش از من و تو زندہ تر!، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، امر شاہد (مرتب)، ص۱۴۶۔

۸۔ مظفر حسین، محولہ بالا، ص۱۰۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ محمد شمشیر، آوازِ دوست۔ حواشی و تعلیقات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی ۲۰۱۹ء، ص۲۷۸۔

۱۱۔ سید قاسم محمود (مدیر اعلیٰ)، انسائیکلوپیڈیا ''پاکستانیکا''، شاہکار بک فاؤنڈیشن، ص۶۸۱۔

۱۲۔ پرویز پروازی، لوحِ ایام، مشمولہ: پس نوشت اور پس پس نوشت، ص۴۰۰۔

۱۳۔ فیصل احمد نقش، محولہ بالا۔

۱۴۔ مصنفین کی تحقیق ہے کہ مختار مسعود کا داخلہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے اسکول میں ۱۹۳۳ء میں ہوا، جب کہ عذرا مسعود کی تحریر سے یہ بات واضح اور ثابت ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۳ء میں دوسری جماعت میں

دوسری پوزیشن حاصل کی، لہٰذا ان کا داخلہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔

۱۵۔ ڈاکٹر نسیم انصاری، جواب دوست، ص ۱۵۔۱۶۔

۱۶۔ مختار مسعود، حرف شوق، ص ۴۲۱۔

۱۷۔ الطاف یوسف زئی، مختار مسعود کا اسلوب، ص ۱۱۔

۱۸۔ مظفر حسین، محولہ بالا، ص ۱۲۔

۱۹۔ نایاب تصویر، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص ۹۔

۲۰۔ اصغر عبداللہ، سفر نصیب کا سفر بھی تمام ہوا، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، امر شاہد (مرتب)، ص ۱۸۷۔

۲۱۔ یہ معلومات عذرا مسعود کی فراہم کردہ ہیں، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے 'مختار مسعود کا اسلوب'، الطاف یوسف زئی، ص ۲۰۔۱۹ (راقمہ)

۲۲۔ محمد اقبال جاوید (مولف)، مختار مسعود مکاتیب کے آئینے میں، ص ۶۔

۲۳۔ شافع قدوائی، ۲۰ رجنوری am ۰۸:۰۹، ورق در ورق: علمی فروغ اردو ادب ایوارڈ

۲۴۔ غلام شبیر رانا، مختار مسعود: مت سمجھو ہم نے بھلا دیا، مشمولہ: سہ ماہی 'الاقربا' اسلام آباد، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۲۹۔

۲۵۔ زاہد منیر عامر، مختار مسعود سے آخری ملاقاتیں، مشمولہ: ماہ نامہ 'الحمرا' لاہور، اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۲۶۔

۲۶۔ محولہ بالا، ص ۱۸۔

۲۷۔ محولہ بالا، ص ۱۷۔

۲۸۔ محولہ بالا، ص ۱۸۔

۲۹۔ زاہد منیر عامر، سائنسدان کا ذہن اور محقق کی طبیعت ۔۔۔۔۔ ادیب مختار مسعود، مشمولہ: ماہنامہ ''پرواز'' لندن، اگست ۲۰۱۷ء ص ۱۶۔

سوانحِ نگاری

(الف) تعارف

اردو سوانحِ نگاری کی بنیاد باقاعدہ طور پر مولانا الطاف حسین حاؔلی نے ''حیاتِ سعدی'' ۱۸۸۴ء میں لکھ کر ڈالی۔ اس سے پہلے اردو سوانحِ نگاری کے ابتدائی کچھ نمونے شعرا اور علمائے کرام کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ یہ بات انتہائی غور طلب ہے کہ حالی نے سوانح نگاری کی بنیاد جن آس یا نظریات پر قائم کی وہ پورے نہیں ہو سکے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ادب میں اس صنف کو اپنی جگہ بنانے میں وقت لگا ہے دوسرے یہ کہ آج بھی اردو ادب میں سوانحِ نگاری کو وہ مقام نہیں مل سکا جو مغرب میں اس صنفِ ادب کو نصیب ہوا ہے۔ اس ادبی تغافل کے باوجود الطاف حسین حاؔلی کے بعد مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، شیخ محمد اکرام، شورش کاشمیری اور غلام رسول مہر ایسی قدآور شخصیات ہیں جنھوں نے سوانح نگاری کو بلند مقام اور تابناک مستقبل عطا کیا اور آج بھی ان ہی کے وضع کردہ اصولوں کی وجہ سے اردو سوانح نگاری اپنی اہمیت و افادیت منوانے میں کامیاب ہے۔ سوانح نگاری کسی انسان کی پوری زندگی کا ایسا بیانیہ ہے جس میں اس کی تمام وارداتِ حیات کو ادبی اسلوب کے ساتھ رقم کیا جاتا ہے جس میں صداقت اور غیر جانبداری بنیادی عناصر ہیں۔ سوانح الیہ کے باطن و ظاہر، علمی و ادبی کارناموں کو رواں اور سہل انداز میں قاری تک پہنچایا جاتا ہے مقصد قاری کو اس کی شخصیت کے پوشیدہ اور اہم گوشوں سے آشنا کرانا ہوتا ہے۔

سوانحِ نگاری کے آغاز وارتقا اور اس میں ہونے والے مختلف اسلوب اور معیارات کے تحت ہونے والے تجربات اور عصر حاضر میں اس کی ہیت و کمیت کے خدوخال کو سہل لفظوں میں یوں بیان کیا جائے تو بہتر ہے۔

سوانحِ نگاری وہ صنفِ ادب ہے جس میں کسی خاص شخص کے حالاتِ زندگی کا ذکر اُس کی

پیدائش سے لے کر وفات تک کیا جاتا ہے۔ جسے ایک فرد کی مکمل داستان اور تاریخ بھی کہا گیا ہے، ابتدا میں سوانحی شواہد مرثیوں، مثنویوں، شاعروں کے تذکروں میں جا بجا ملتے ہیں۔ سوانح نگاری میں مصنف ممدوح کی زندگی میں رونما ہونے والے اہم واقعات اور ممدوح کی نفسیاتی کیفیات کو ادبی انداز سے ایک مورخ اور مصور کی طرح مبالغہ آرائی کے بغیر بیان کرتا ہے کہ اُس شخص کی شبیہ بالکل ویسی ہی ابھر کر نظر آئے جیسا وہ تھا۔ جس کے لیے سوانح نگار کو اپنے ممدوح کی کتب، مکاتب، روزنامچوں، ڈائریوں، آپ بیتیوں، مضامین، تقاریر، سرکاری کاغذات، انٹرویوز، چشم دید واقعات اور اس کے ادبی دوست احباب اور خاندان والوں سے مدد لینی پڑتی ہے جو مصنف کے لیے تحقیقی اور صبر آزما کام ہوتا ہے، اس کے بعد وہ اپنے ممدوح کی خوبیوں، کمزوریوں اور اس کے خدوخال کا نقشہ محتاط انداز سے تحقیق کی روشنی میں مصوّر کرتا ہے اور واقعات وحالات کو بڑی روانی، خوش اسلوبی اور اپنے دلفریب اندازِ تحریر کے ساتھ عقیدت ومحبت سے ایک کہانی کے طور پر قاری کے سامنے ممدوح کا وہی عکس پیش کرتا ہے جیسا وہ حقیقی زندگی میں تھا۔ سوانح نگاری کو ابتدا میں تاریخ کی شاخ بھی قرار دیا جاتا رہا اور اس کے اصول اور طریقوں پر بھی تاریخ کے اثرات موجود ہیں کیوں کہ اس میں شخصیت کے کردار کی عکاسی کے ساتھ اس کے عہد کا بیان بھی تواتر کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے، جس میں معاشی، سماجی، سیاسی، مذہبی اور ادبی حالات و واقعات کو حقائق کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے سوانح نگار ایک سچا مورخ معلوم ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ سوانح نگاری کو تاریخ نگاری کے سائے میں پروان چڑھایا گیا ہے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔

سوانح نگاری ادب کی ایک مقبول اور دلچسپ صنف کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی ہے، جس میں سوانح نگار اپنے ممدوح کی مکمل زندگی کا احاطہ بھرپور انداز سے کرتا ہے۔ اردو ادب ہو یا عالمی ادب، سوانح نگاری پسندیدہ اور ہاتھوں ہاتھ بکنے والی صنف ہے۔ ''سوانح'' خود اپنی نہیں لکھی جاتی بلکہ کسی دوسرے ادیب وشاعر وغیرہ پر لکھی جانے والی صنف ہے مختلف تحقیقی طریقوں سے سوانح

نگاراس کے مواد کا حصول اپنے لیے جس جدوجہد سے ممکن بناتا ہے وہ صرف اس کا ہی وصف ہے۔ وہ ممدوح کی ذات کے تمام اوصاف کو صداقت کے ساتھ جلوہ گر کرتا ہے۔ سوانح نگاری اپنے پس منظر اور پیش منظر کے آئینے میں قاری کے سامنے مختلف رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔ دنیا میں انگنت لوگ پیدا ہوتے ہیں اور سب کی زندگی کی داستان ایک دوسرے سے مختلف رنگ و آہنگ میں ہوتی ہیں اور پڑھنے والے پر اس کی زندگی کے رازوں سے سوانح نگار دل آویزی اور تسلسل سے پردہ اٹھاتا جاتا ہے اس کے خاندانی پس منظر کا احوال اور اس کی جدوجہد، کاوشوں اور زندگی کے میدان میں نمایاں کامیابیوں چاہے وہ دنیاوی ہوں یا دینوی ان کا بیان سوانح نگار جس عمدگی سے واقعات کی بُنت کر کے اپنی فنی مہارت کے اظہار کا ثبوت دیتا ہے اس پر قاری عش عش کرتا ہے۔

سوانح نگار ممدوح کی زندگی کے سفر کی روداد میں اس کی کامیابیوں کے ساتھ ناکامیوں اور محرومیوں کا تذکرہ بھی گاہے بگاہے کرتا ہے جیسے کسی بھی انسان کی زندگی صرف خوشیوں اور کامیابیوں سے عبارت نہیں ہوتی تمام انسانوں کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور یہی زندگی کا اصل حسن ہوتا ہے۔

سوانح نگاری محض ایک شخص کی داستانِ زندگی نہیں بلکہ ایک خطے کی تاریخ، تہذیب، سیاست، مذہب، حالات، مشاہدات اور تجربات کی وہ دلچسپ کہانی ہے جو کسی تاریخی داستان سے کم معلوم نہیں ہوتی ہے۔ سوانح نگاری سے معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے ممدوح کی صرف مدح سرائی کے بجائے حالات و واقعات کو حقائق کے روشنی میں مبالغہ آرائی کے بغیر ادب کی چاشنی میں من و عن اپنے منفرد اسلوب کی بدولت روانی سے پیش کرتا چلا جائے۔ اصل میں یہی سوانح نگاری کا حسن ہے۔ سوانح نگاروں نے صرف ادبی شخصیات کی سوانح نہیں لکھیں بلکہ مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کی بھی سوانح قلم بند کی ہیں جو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

سوانح نگار نے اگر شخصیت کی صحیح کلید دریافت کرلی ہے یعنی شخصیت کی کلید کے طور پر اس خصوصیت کو اہمیت دی ہے، جو حقیقتاً اس کے تمام عواطف و جذبات، رجحانات و میلانات اور مظاہر شخصیت کا منبع و مصدر ہے تو سوانح نگار صحیح نتائج تک ہماری رہنمائی کرسکتا ہے اور اگر سوانح نگار نے کسی ایسی خصوصیت کو جو درحقیقت ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور کسی دوسری خصوصیت کا محض ایک نتیجہ ہے، بنیادی اہمیت دے کر اسے کلید کا درجہ عطا کردیا ہے تو شخصیت کی تصویر بگڑ کر رہ جائے گی اور سوانح بہتر نتائج کے طور پر ہماری رہنمائی نہیں کرپائیں گے ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ سوانح نگار کسی شخص کے جذبۂ خدمت کو اس کی شخصیت کی کلید قرار دے کر اس کی پوری زندگی کو جذبۂ خدمت کا نمونہ بنا کر رکھ دے، جب کہ اس کا جذبۂ خدمت محض ہوسِ شہرت یا تمنائے خود فراموشی کا مظہر ہوسکتا ہے۔ سوانحِ نگار خوف کو غیر مشروط طور پر کسی شخصیت کی کلید قرار نہیں دے سکتا ہے، خوف حُبِ ذات، جنونِ مطالعہ اور شوقِ علم سے بھی جنم لے سکتا ہے یہ تلخ حقائق سے گریز کی بھی ایک صورت ہوسکتی ہے۔ اوّل الذکر صورت میں جنونِ مطالعہ کو نہیں شوقِ علم کو شخصیت کی کلید قرار دینا ہوگا اور موخر الذکر صورت میں اس آزردگی کو جو ناکامیوں کے باعث شخصیت میں گھر کر رہ جاتی ہے۔ شوقِ علم بھی ہوا میں جنم نہیں لیتا اور آزردگی یا اُسے جنم دینے والی ناکامیوں کے اسباب بھی موضوعِ سوانح کی شخصیت اور اس کی خارجی دنیا میں ڈھونڈنے پڑیں گے۔

سوانح نگاری ہمیشہ ذاتی واقفیت کے سہارے لکھی جاتی ہے اس لیے ضمیر واحد متکلم کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔ اکثر سوانح نگار ضمیر واحد متکلم کے استعمال سے فائدہ اٹھاتے ہیں جس کے سبب سوانح موضوعِ سوانح سے ہٹ کر سوانحِ نگار کے تعلق کا اشتہار بن کر رہ جاتی ہے جو ادبی بد دیانتی شمار کی جاتی ہے۔ سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ شخصیت کو مظاہر شخصیت ہی کے وسیلے سے دیکھے اور قاری کو دکھائے، چونکہ ادب بھی کسی نہ کسی روپ میں شخصیت کا مظہر ہے اس لیے اس سے مدد لی جاسکتی ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لیے یہ معلوم کرنا لازمی ہے کہ اس شخصیت کا ادب میں مقام اور مرتبہ کیا ہے کیوں کہ جسے قاری بہادری سمجھ رہا ہو وہ بزدلی ہو۔ ادعائے تقدیس کے پیچھے

خواہشِ تکریم بھی کارفرما ہو سکتی ہے۔ یہ بات تو ادب اور نفسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ برتری کا الجھاؤ احساس کمتری کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ سوانح نگاری کے تقاضوں کے تحت یہ بد رنگ لکیریں ہیں بھی ضروری مگر ذہانت اور فنی کمال اس میں ہے کہ انھیں ایسے سلیقے سے لگایا جائے کہ تصویر کی دلکشی میں اضافہ نہ ہو سکے تو کم از کم وہ دلکشی کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ بن سکیں۔

سوانح نگار سے یہ توقع رکھنا درست نہیں کہ وہ سوانح میں سب کچھ لکھ دے جو اس کے علم میں ہے بلکہ سوانح نگار کو صرف وہ باتیں منتخب کرنی چاہیں جس سے شخصیت اجاگر ہو سکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر حرکت، ہر بات اور گفتگو کا ہر جملہ شخصیت کا مظہر ہوتا ہے تو یہ بھی درست ہے لیکن شخصیت پر روشنی ڈالنے والی باتوں میں کچھ ایسی بھی ہوں گی جو شخصیت کو بہتر طریقے سے اُجاگر کر سکیں۔ سوانح کے واقعات میں حسن پیدا کرنا بھی اہم مسئلہ ہے واقعہ اس خوب صورتی سے پیش کیا جانا چاہیے کہ بقیہ اس جیسے واقعات کو پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ فنی ضرورتوں کے تحت بعض واقعات کو چھوڑنا پڑتا ہے اور کچھ واقعات کو مصلحتوں کے تحت چھوڑنا پڑتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ سوانح میں قانونی تقاضوں کے تحت بعض باتوں کو چھوڑنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ بعض باتیں اس لیے چھوڑنی پڑتی ہیں کہ وہ شائستگی کے منافی ہوتی ہیں۔

۳۔ کچھ باتیں خوف کی وجہ سے چھوڑ دی جاتی ہیں کہ ان کا تذکرہ زیرِ نظر شخصیت اور اس کے عزیزوں کی مخالفت کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔

سوانح نگاری میں یہی بات ادبی تنازعے کا سبب بنتی ہے، ہر ملک اور ہر قوم میں مروت اور رواداری کا معیار جدا ہے، بعض خامیوں کو مغرب میں ایسی عام انسانی کمزوریاں سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بھی عظیم المرتبت شخص جگ ہنسائی اور رسوائی کے کسی خطرے کے بغیر ان برائیوں کا برملا اعتراف کر سکتا ہے اور سوانح نگار ان خامیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کر دے تو شخصیت اور اس کے عزیز صرف مسکرانے پر اکتفا کریں گے۔ سوانح نگار تو ممدوح کا تعارف کروا رہا ہے۔ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ لوگ اس تعارف کی روشنی میں اس کے دوست سے نفرت کرنے لگیں یا خود ہی

اس کا عزیز دوست اس سے ناراض ہو جائے۔ اس لیے سماجی اقدار کی روشنی میں جتنی حقیقت ممکن ہو بیان کی جائے، سوانح نگار سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

سوانح کا معیار اس کی طوالت نہیں ہوتا بلکہ اس کی فنی حدود و شرائط ہیں مگر ان فنی حدود و شرائط کو نبھانے کے لیے ایک خاص حد تک طوالت بھی ضروری ہوتی ہے چونکہ سوانح نگار کا مقصد شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر بنانا ہوتا ہے اس کے لیے کسی نہ کسی حد تک تفصیل میں اترنا یعنی مظاہر شخصیت سے دلچسپی لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ سوانح نگار براہ راست اپنے مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات کے سہارے نہایت اختصار کے ساتھ چند صفحوں میں شخصیت کی ہو بہو جیتی جاگتی تصویر بنا دیتا ہے تو اسے مزید صفحات لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

سوانح نگاری کی لغوی تعریف معتبر انگریزی آکسفورڈ ڈکشنری میں یوں درج ہے کہ:

''سوانح نگاری بطور ایک ادبی صنف کے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے۔'' [۱]

جب کہ ممتاز ادیب اور دانشور ''کارلائل'' کے نزدیک:

''سوانح نگاری ایک انسان کی حیات ہے۔'' [۲]

روایتی سوانحِ نگاری کے ساتھ ہی سائنسی، مذہبی اور اخلاقی نوعیت کی بھی مقبول سوانح لکھیں گئیں ہیں جس کی تفصیل کا یہاں محل نہیں ہے۔ خطوط، روزنامچے اور یادداشتیں سوانحِ نگاری کے نہ صرف ماخذ ہیں۔ بلکہ اس کو ادب کی مستقل صنف بنانے کے لیے انہوں نے ادبی فضا کو سازگار بنایا ہے اس کے اصول و مسائل مثلاً موضوع، مواد، اسلوب اور حقائق کی ترتیب و تہذیب نے سوانح نگار کو وہ زمین میسر کی جس پر وہ اپنے ممدوح کی شخصیت کی عمارت کاری کرتا ہے۔

سوانحِ نگاری کو فنی اور اسلوبیاتی اعتبار سے جو تقویت ملی اس کی وجہ سے ادب میں عام طور پر اور سوانح نگاری میں خاص طور پر نئے رویے اور نئے رجحانات سامنے آئے ہیں۔ جس کی وجہ سے سوانح نگاری کو بڑی پزیرائی حاصل ہوئی۔ ادب کی نثری اصناف میں کسی نہ کسی حوالے سے سوانحِ نگاری دکھائی دیتی ہے۔

سوانح کو شخصیت نگاری اور مرقع نگاری بھی کہا جاتا ہے، لیکن شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری میں وہی فرق ہے جو پورٹریٹ اور اسکیچ میں ہوتا ہے۔ میرے نزدیک خاکہ پورٹریٹ کا نہیں اسکیچ کا درجہ رکھتا ہے البتہ شخصیت نگاری کے لیے پورٹریٹ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ سوانح نگاری میں جہاں شخصیت کے اخلاق محاسن و معائب، مخصوص عادات، اخلاقیات و مذہب اور سماجی و معاشی رویوں کی سچی اور غیر جانبدار عکاسی کی جاتی ہے۔ وہیں اس امر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ سوانح ایک تخلیقی صنف ادب ہے۔ جس میں زندہ شخصیت کا جسم علمیت کے بھاری عبا کو اتار کر روزمرہ کے لباس میں نظر آتا ہے اور ہم انھیں ویسا دیکھ پاتے ہیں جیسا کہ اصل میں وہ ہوتے ہیں۔

ادب میں خودنوشت کو کئی اعتبار سے سوانح نگاری پر فوقیت حاصل ہے جس کی سب سے بڑی وجہ خودنوشت یا آپ بیتی کے بیانیہ میں موجود صداقت اور غیر جانبداری رقمطراز پر ہوتی ہے عمومی طور پر خودنوشتیں احساسِ برتری کے زیر اثر لکھیں گئیں ہیں۔ خطوط اور روزنامچے بھی خودنوشت کے ذرائع میں شمار ہوتے ہیں جب کہ دیگر ذرائع بھی آج اس ضمن میں مددگار ہیں لیکن ان سے استفادہ کرتے وقت سوانحِ نگار کو انتہائی احتیاط، تحقیق اور غیر جانبداری سے کام لینا اشد ضروری ہے بغیر کسی ٹھوس شہادت کے کسی ابلاغی ذرائع سے نتائج اخذ کرنا شخصیت اور تاریخ دونوں کو مسخ کرنے کے مترادف ہوسکتا ہے۔ سوانحِ نگار کو چاہیے وہ اپنے ممدوح کی صرف تصویر کشی نہ کرے بلکہ اپنے موضوع میں اس حقیقت کے ساتھ خوب صورت رنگوں کا چناؤ بھی کرے۔ جس سے اس کے ممدوح کی شخصیت ہر رنگ میں واضح نظر آئے سوانح نگار کو اپنی صلاحیتوں کو اس طرح بروئے کار لانا چاہیے جس سے اس کی سوانحِ نگاری سند ہو۔ افسانہ کا شائبہ نہ ہو، اور قاری بھی شخصیت کی تہہ داری سے آشنا ہوسکے۔

اردو سوانحِ نگاری اور خودنوشت نگاری کے اس جائزے کے بعد اردو ادب میں صنفِ سوانح نگاری کے تغیر کو ہم آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے تناظر میں اجمالی طور پر پرکھتے ہیں۔

(ب) سوانحِ نگاری آزادی سے قبل

سترہویں صدی سے انیسویں صدی کے اختتام تک اردو ادب میں سوانح نگاری کے ابتدائی آثار کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں سوانحی عناصر کے لحاظ سے پہلے پہل غیر مربوط مجموعے ہمیں دکنی ادب میں ملتے ہیں۔''[۳]

دکنی ادب میں، سوانحِ نگاری کے یہ تمام ابتدائی نمونے منظوم ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے فیروز کی مثنوی ''توصیف نامہ'' کو اردو کی پہلی سوانح عمری قرار دیا ہے [۴]۔ اسی طرح نصرتی کی ''علی نامہ'' اور ''گلشنِ عشق'' میں بھی سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں۔ مثنویوں کی طرح قدیم مرثیوں میں بھی سوانحی عناصر کے نمونے موجود ہیں جن میں شعرا نے شہید و غازی کا جواں مردی سے سخت جان حالات سے نبرد آزما ہونے کا بیان کیا ہے۔

مثنوی اور مرثیے کے بعد ہم ادب کی مشہور صنف تذکرہ نگاری میں سوانحِ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں۔ اگرچہ سوانحِ نگاری ان میں بھی مستند اور مبسوط نہیں ملتی کیوں کہ تذکرے میں کسی کی کہی ہوئی باتیں، اپنی معلومات، اور دستیاب تذکروں سے مواد اکٹھا کیا جاتا ہے اس لیے سوانحی ادب میں اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، تذکرہ نگاری میں کوئی اصول وضع نہیں اور ابتداً تحقیق سے یہ کام لیا بھی نہیں گیا اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں خطوط، کُتب، رسائل اور روزنامچوں کا بہ آسانی دستیاب ہونا ناممکنات سے تھا اور زیادہ تر تذکروں کا اسلوب فارسی طرزِ تحریر کا سا تھا۔

''نکات الشعرا'' میر تقی میر کا فارسی میں اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے بعد میں اردو کے تمام تذکرے اسی طرز پر لکھے گئے اردو کا مشہور تذکرہ ''آبِ حیات'' مصنف محمد حسین آزاد میں بھی وہی روایتی انداز ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ممدوح کی توصیف مبالغہ کو چھوتی ہوئی لگتی ہے۔

مکتوب نگاری کو بھی سوانحِ نگاری میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے شعرا اور ادبا کے مکتوبات

سے سوانح نگاری میں کافی حد تک مدد ملتی ہے جن میں سرفہرست مرزا غالبؔ، سر سید احمد خان، علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال شامل ہیں۔ نجی خطوط کسی بھی انسان کے جذبات واحساسات کا وہ بیانیہ ہوتا ہے جو مکتوب الیہ سے اس کے رشتے رویے اور تعلقات کی نہج کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح خطوط ماہ وسال سے وابستہ اہم شخصیات تاریخی، ادبی اور سماجی معلومات کا ماخذ بھی ہوتے ہیں۔
ڈاکٹر خلیق انجم سوانحِ نگاری میں خطوط کی افادیت اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سوانحِ نگاری کے بہترین مآخذ خطوط ہوتے ہیں فنکار کے خاندانی حالات اس کی زندگی کے بیشتر واقعات، اس کے عقائد ونظریات، اس کی سیرت وشخصیت کا پورا علم ان ہی خطوط سے ہوتا ہے۔ فنکار اپنے پیش رو فنکاروں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، اپنے ہم عصروں کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اپنے فن اور خود اپنی ذات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے، یہ سب بہت واضح انداز میں تو فنکار کے خطوط میں، اور اکثر ذرا مبہم آپ بیتیوں اور روزنامچوں میں ملے گا۔'' [۵]

اردو زبان میں جدید انداز کے خطوط لکھنے والے پہلے مکتوب نگار مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ہیں انھوں نے ہی اس صنف کو اردو میں متعارف کرایا اور حقیقت یہ ہے کہ ان ہی خطوط کی روشنی میں غالبؔ کی سوانح عمریاں لکھی گئیں ہیں۔

''روزنامچہ'' اُس تحریر کو کہا جاتا ہے جس میں روزانہ کی بنیاد پر حالات وواقعات کو قلم بند کیا جائے۔ روزنامچہ کو مغرب میں اعتبار حاصل ہے لیکن ہمارے یہاں یہ صنف کوئی مقبول مقام حاصل نہیں کر سکی، اس کی ایک وجہ سچائی سے حقائق لکھنے کی جسارت کا نہ ہونا ہے پرانے زمانے میں کچھ بادشاہوں اور ادیبوں نے روزنامچے لکھے بہر حال سوانحِ نگار کے لیے یہ مواد بہت اہم ثابت ہوتا ہے۔

خودنوشت یا آپ بیتی ادب کی وہ اہم صنف ہے جس میں مصنف اپنی حیات کے تمام

حالات و واقعات من و عن سچائی کے ساتھ رواں دواں اور سہل انداز میں پیش کرتا ہے خود نوشت نگاری کو اردو ادب میں وہ جگہ نہ مل سکی جو سوانح نگاری کو ملی اس کی بنیادی وجہ مبالغہ آرائی کے ساتھ عمر عزیز کا بیان کرنا ہے جب کہ سوانح نگاری میں سوانح نگار غیر جانبدار ہو کر اپنی تحقیق سے مواد اکٹھا کر کے صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے تین سوانح عمریاں لکھیں اور تینوں ہی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ حالیؔ اردو میں سوانح نگاری کے بانی ہیں ان کے سر ہی اس صنف کو اردو میں متعارف کرانے کا سہرا ہے۔ حالیؔ کی تمام سوانح عمریاں مغرب کے زیر اثر تھیں۔ ''حیاتِ سعدی'' حالیؔ کی پہلی سوانح عمری ہے جو فارسی زبان کے مشہور و معروف شاعر شیخ سعدی شیرازی کی ہے۔ حالیؔ کی دوسری قابلِ ذکر سوانح عمری مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی ہے جو ''یادگارِ غالب'' کے نام سے ہے۔ یہ غالبؔ کی زندگی پر لکھی جانے والی سوانح عمریوں میں سب سے مستند ہے۔ اس میں حالیؔ نے غالبؔ کے کچھ اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔ ''حیاتِ جاوید'' یہ سوانح سر سید احمد خاں کی ہے۔ حالی سر سید سے بہت متاثر تھے شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس میں غیر جانبداری کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ اپنے ممدوح کی مدح سرائی غلو کی حد تک کرتے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کے بعد سوانح نگاری میں علامہ شبلی نعمانی کا نام آتا ہے ان کی تمام سوانح عمریاں مسلم فاتحین پر ہیں جن میں شبلی سوانح نگار سے زیادہ مورخ کے طور پر نظر آتے ہیں۔ شبلی کی پہلی سوانحی تصنیف ''المامون'' ہے جو انہوں نے مامون الرشید پر لکھی اس سوانح عمری کو شبلی نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا پہلے حصے میں تاریخ اور دوسرے حصے میں مامون الرشید کے حالاتِ زندگی ہیں۔

''سیرت النعمان'' یہ سوانح عمری حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ بن ثابت کی ہے جن کی شخصیت سے متاثر ہو کر شبلی نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لگایا۔ مذہبی اور اسلامی حوالے سے یہ ایک بہترین سوانح عمری ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح ''الفاروق'' کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

''سیرۃ النعمان'' کی طرح ''الفاروق'' بھی بڑے پائے کی سوانح عمری شمار کی گئی ہے۔ ''الغزالی'' اس میں انہوں نے امام غزالی کے فلسفہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اسی طرح ''سوانح مولانا روم''، میں شبلی نعمانی نے مولانا کی حکمت اور ان کی مثنوی کو موضوع بنا کر تفصیل سے پیش کیا ہے۔''سیرت النبیؐ''، شبلی نعمانی نے حضور پاک کی سیرت پر جس اہتمام اور تحقیق سے دو جلدیں لکھیں وہ عقیدت کا اظہار اوران کی علمیت کا ثبوت ہیں۔شبلی کے انتقال کے بعد بقیہ چار جلدیں ان کے شاگرد سیّد سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔

سوانح میں سوانحِ نگار اس دور کی تہذیب واضح کرتا دکھائی دیتا ہے۔آزادی سے پہلے کی سوانح عمریوں میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی حالات کی تصاویر ہو بہو نظر آتی ہیں۔۱۹۱۴ء کے بعد لکھی جانے والی سوانح عمریوں میں صرف اپنے ممدوح کی تعریف وتوصیف ہی نہیں بلکہ شخصیت کو بھی واضح کیا گیا۔اس وقت بھی سوانح مغرب کے زیر اثر تھیں اور بہترین سوانح کہلانے کے لائق تھیں اسی دور میں ایسی سوانح عمریوں کی ضرورت بھی پیش آئی جو صرف بچوں اور عام لوگوں کے لیے لکھیں گئیں، سوانحِ نگاروں نے سیاسی رہنماؤں، شعرا اور ادیبوں کی سوانح لکھیں جو تحسین کے لائق ہیں۔

آزادی سے قبل وہ سوانحِ نگار جو اس فن میں مہارت رکھتے تھے ان میں نمایاں نام سید سلیمان ندوی کا ہے۔یہ علامہ شبلی کے شاگرد تھے اوران کا اسلوب بھی شبلی جیسا تھا۔ان کے بارے میں شاہ معین الدین ندوی فرماتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کے کاموں کی مدت بتیس سال ہے اور سید صاحب کی تقریباً نصف صدی اس طویل مدت میں انہوں نے گونا گوں مذہبی، علمی اور قومی وملی اور سیاسی کام انجام دیے۔''[۶]

سیّد سلیمان ندوی کی سب سے پہلی سوانح عمری ''سیرتِ عائشہؓ'' ہے۔یہ اُمہات المومنین پر لکھی جانے والی پہلی مستند سوانح ہے۔دوسری سوانح ''حیاتِ مالک'' ہے اس میں امام مالک کے

تاریخی واقعات اور ان کی علمی قابلیت کو موضوع بنایا گیا ہے خود اس سوانح کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''آج کل ملک میں علوم اسلامیہ کی طرف سے جو سرد مہری اور بے اعتنائی برتی جارہی ہے اور جو انگریزی تعلیم کی وسعت کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے ان کی روک تھام کے لیے مصلحین کے سامنے مختلف صورتیں پیش ہیں منجملہ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ملک میں تاریخ کا مذاق کس قدر پیدا ہو گیا ہے اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اس ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح کی جائے۔'' ۷

علامہ شبلی نعمانی نے سوانح میں اسلامی تاریخ کو مدِ نظر رکھا اسی طرح ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے بھی اس کام کو آگے بڑھایا اور امام مالک کی سوانح اسی بات کی دلیل ہے ''رحمتِ عالم'' سید سلیمان نے بچوں اور کم تعلیم یافتہ افراد کے لیے لکھی جس کا اسلوب بہت سادہ اور رواں ہے وہ خود اس سوانح کے بارے میں کہتے ہیں:

''ایک زمانے سے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے سیرت کی ایک ایسی چھوٹی سی کتاب لکھوں جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کے لیے آسان ہو اور پھر اس میں کوئی اہم بات چھوٹنے نہ پائے''۔ ۸

''سوانح رحمتِ عالم'' (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کا آغاز بچوں کی کہانیوں کا سا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم اللہ کے محبوب ہونے کے باوجود تمام کام ایک عام آدمی کی طرح انجام دیتے تھے سلیمان ندوی نے سوانح کے آغاز میں لکھا ہے کہ:

''ہمارے ملک میں پچھّم کی طرف سمندر بہتا ہے اس سمندر کے ایک کنارے پر ہندوستان اور دوسرے کنارے پر عرب کا ملک ہے، عرب کا

بڑا حصہ ریت اور پہاڑ ہے اور بیچ کا حصہ تو بالکل بنجر اور غیر آباد صرف اس کے کناروں پر سبزی اور شادابی ہے۔''۹

سید سلیمان ندوی نے ''سوانح عمر خیام'' میں خیام کی رباعیوں کی بجائے اس کے فلسفے کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے ورنہ عمر خیام کو پہلے صرف رباعیوں کے باعث ہی جانا جاتا تھا خیام کے فلسفے پر وہ لکھتے ہیں:

''خیام کی نسبت ہر زبان میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس موضوع میں کوئی جدت باقی نہیں رہی تاہم میں نے اس پر قلم اٹھانے کی جرات کی جس کی صرف دو جہتیں ہیں ایک تو یہ کہ اس کے بعض واقعات تصانیف کے سنین کے متعلق مجھے کچھ کہنا تھا اور اپنی فکری کاوش اور جدوجہد کے نئے نتیجے اربابِ نظر کے سامنے پیش کرنے تھے اور دوسری یہ کہ اب تک لوگوں نے اس کو صرف رباعیوں ہی کے ذریعہ سمجھنا چاہا تھا جن کی تعین سراسر مشکوک ہے اور میں نے اس کو اس کی خاص فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ روشناس کرایا ہے جن میں وہ بالکل ایک نیا شخص معلوم ہوتا ہے۔''۱۰

اس کے علاوہ خیام کے حوالے سے جو بے بنیاد باتیں سامنے آئیں تھیں ان کو تنقیدی تبصرے سے دور کیا اور لوگوں کو اصل حقیقت سے روشناس کروایا، سلیمان ندوی کی آخری اور معروف سوانح اپنے قابل رشک واحترام استاد علامہ شبلی نعمانی پر ''حیاتِ شبلی'' ہے، شیخ محمد اکرام نے اس بارے میں کہا ہے:

''حیاتِ جاوید کے بعد شاید حیاتِ شبلی ہماری زبان کی سب سے مفصل سوانح عمری ہے۔''۱۱

سید سلیمان ندوی اس سوانح کے بارے میں رائے دیتے ہیں:

''نو سو صفحات کی کتاب صرف اس عہد کے اس شخص کی سوانح عمری نہیں

بلکہ در حقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی
، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے۔''[۱۲]

حیاتِ شبلی بھی بعض غیر ضروری تفصیلات کا شکار ہے۔

''مثلاً ندوۃ العلماء کے اجلاس کی تفصیل غیر ضروری تھی، شبلی کے پاؤں
کے حادثے پر جتنے بھی قطعات، قصائد اور نظمیں لکھیں گئیں وہ سب کے
سب خواہ مخواہ درج کی گئیں ہیں۔''[۱۳]

بقول آلِ احمد سرور:

''مجموعی طور پر، حیاتِ شبلی اپنی جامعیت، مواد کی فراوانی، واقعات کی
تفصیل، موضوعات کے مباحث کی وسعت استدلال اور حوالوں کی صحت
کے باوجود شبلی کی ترجمانی ہے تنقید نہیں۔''[۱۴]

''حیاتِ شبلی'' میں کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سوانح نگار کا ممدوح سے عقیدت و احترام کا رشتہ ہے لیکن اس کی خوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ حیاتِ شبلی صفِ اوّل کی سوانح عمریوں میں شمار کی جاتی ہے۔

اسلم جیراج پوری کی سوانح عمریاں ''حیاتِ جامی''، ''حیاتِ حافظ'' اور ''سیرت عمرو بن عاصم'' مختصر سوانح ہیں ان پر شبلی کی سوانح عمریوں کے اثرات نمایاں ہیں۔

''حیاتِ جامی'' میں مصنف نے ہیرو کے حالات فارسی تذکروں اور مولانا جامی کے معاصرین کی کتابوں سے اخذ کیے ہیں، مثلاً رشحات لطائف الطوائف، تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور مجالس العشاق وغیرہ ہیں۔[۱۵]

مولانا جامی کی سوانح میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات پوری طرح سے موجود نہ ہونے کے سبب مصنف نے ان کے کارناموں کو مدِ نظر رکھ کر ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء کے دورانیہ میں فوق بلگرامی نے متعدد ایسی سوانح لکھیں جن کا موضوع

اور مواد ائمہ اثنا عشری اور خلافت کے تنازعات پر مبنی ہے ان میں سوانح کم اور مناظرانہ رنگ غالب ہے۔ بہر حال مواد کی یکجائی محنت سے کی گئی ہے۔

''سیرت عمر بن عبدالعزیز'' کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی رقم طراز ہیں:

''ہماری زبان میں عمر بن عبدالعزیز کی متعدد سوانح عمریاں لکھیں گئیں ہیں، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان مرقعوں میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تصویر کے اصل خدو خال نمایاں نہیں ہو سکے۔ اس لیے ان کے شایانِ شان ایک دوسری تصنیف کی ضرورت تھی اور اسی ضروت نے مجھ کو اس کتاب کے لکھنے پر مجبور کیا۔''[16]

سوانح نگار نے عرق ریزی سے سوانحی جزئیات تحقیق و دلائل کے ساتھ قلم بند کیے ہیں جس کی بنا پر سیرت عمر بن عبدالعزیز کو علمی حلقوں میں قبول و مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔

حبیب الرحمان خاں شیروانی نے بھی دو معروف سوانح عمریاں لکھیں۔ ''تذکرہ بابر'' اور ''سیرتِ صدیق''۔ ''تذکرہ بابر'' میں مصنف کا اپنے ممدوح سے محبت کا اظہار صاف ظاہر ہوتا ہے۔ بابر کی شخصیت کے بجائے اس کے کارناموں کو موضوع بنایا ہے جب کہ ''سیرتِ صدیق'' اس سے بہتر سوانح ہے اسلوب میں روانی اور سادگی نمایاں ہے۔ بچوں کو مشاہیرِ اسلام کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے جو سوانح لکھیں ہیں ان میں ''سیرتِ صدیق'' (رضی اللہ عنہ) کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔

۱۹۲۵ء میں نواب وقار الملک کی سوانح عمری ''وقار حیات'' اکرام اللہ ندوی نے حبیب الرحمان خاں کی فرمائش پر بڑی محنت سے لکھی۔ اس سوانح کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اس کے بارے میں کہتے ہیں:

''صوبیداری کے دفتر میں نواب صاحب مرحوم کے عہد کے کاغذات کا کافی ذخیرہ تھا۔ ہزاروں صفحے تو مختلف مقدمات کے فیصلوں سے متعلق تھے

جو خود نواب صاحب مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اس طومار کا پڑھنا اور سمجھنا اور ضروری مضامین کا انتخاب کرنا آسان کام نہ تھا، لیکن مسلسل مصروفیت نے اس دشواری کو حل کر دیا۔'' ۱۷

رئیس احمد جعفری نے بھی ۱۹۳۲ء سے سوانح نگاری کا آغاز ''سیرتِ محمد علی'' سے کیا۔ یہ سوانح ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل مولانا محمد علی جوہر پر مستند کتاب ہے۔ سوانح نگار نے سوانح کے جدید اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوانح عمری کو دو حصوں میں بانٹ کر پہلے حصے میں ۳۲ باب رکھے اور دوسرے حصے میں ۵۲ باب ترتیب دیے۔ اس میں ان کی زندگی سے متعلق حالات و واقعات کو ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔

الطاف علی بریلوی نے ''حیاتِ حافظ رحمت خان'' کی سوانح عمری ۱۹۳۴ء میں لکھی۔ اس سوانح میں پہلی بار روہیل کھنڈ کے سپہ سالارِ اعظم کے حالات کو بہت دلکش انداز سے پہلی بار اردو زبان میں لکھا ہے۔

۱۹۳۴ء میں ''حیاتِ محسن''، ۱۹۳۸ء میں ''تذکرہ وقار'' اور ۱۹۳۹ء میں ''حیاتِ سلطانی'' یہ تینوں سوانح عمریاں سوانح نگار محمد زبیر کی لکھی ہوئی ہیں انھوں نے اپنے زمانے کی معروف شخصیت کی زندگیوں کو متعارف کروایا ہے۔

۱۹۳۶ء میں سوانح نگار غلام رسول مہر نے غالب کی سوانح عمری ''غالب''، لکھی جس کے بارے میں عبدالمجید سالک کا کہنا ہے کہ:

> ''مہر صاحب نے سوانح عمری کی ایک تیسری قسم ایجاد کی ہے کہ صاحب سوانح کے کلام نظم ونثر اور اس کی نجی تحریروں سے اس کے حالاتِ زندگی فراہم کیے، جن کی صداقت سے کوئی دوسرا شخص تو درکنار خود صاحب سوانح بھی انکار نہیں کر سکتا۔'' ۱۸

غلام رسول مہر نے ۱۹۲۵ء میں ۶۶ صفحات پر مشتمل مختصر سوانح عمری ''سیرتِ امام ابن تیمیہ''

لکھی اس سوانح میں امام کی نجی زندگی کی بجائے ان کے کاموں کو مکمل طور پر بیان کیا گیا ہے، دراصل یہ سوانح اسلامی شخصیات کی طرزِ زندگی کے مطابق ہے اس کی غایت کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''اس سے مقصود یہ ہے کہ دنیا کسی نہ کسی حد تک امام ممدوح سے روشناس ہو سکے۔'' [19]

شیخ محمد اکرام نے علامہ شبلی نعمانی کی سوانح ''شبلی نامہ'' سوانح نگاری کے جدید اصولوں پر تحریر کی اس سے پہلے سوانح عمریاں طوالت کا شکار تھیں اور غیر ضروری واقعات سے سوانح کا حُسن ماند پڑتا تھا۔ شیخ محمد اکرام نے سوانح کو اس انداز سے لکھا کہ قاری سوانح عمری پڑھنے میں دلچسپی لے، اس بارے میں شیخ محمد اکرام کا کہنا یہ ہے کہ:

''شبلی نامہ'' کو اعتدال، توازن اور جدید سوانحی نقطہ نظر کی ایک ہلکی پھلکی لیکن مستقل سوانح عمری کا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔'' [20]

مصنف نے شبلی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو خوب صورتی سے ابھارا ہے جس سے شبلی کی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔

۱۹۳۶ء میں شیخ محمد اکرام نے سوانح ''غالب نامہ'' لکھی یہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سوانح عمری ہے جس کے لکھنے میں سوانح نگار نے اُن کی اردو تصانیف سے زیادہ فارسی تصانیف سے مواد یکجا کیا ہے اس سوانح سے قبل غلام رسول مہر بھی غالب کی سوانح لکھ چکے تھے جس کے بارے میں شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ:

''مولانا کی کتاب پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ انہوں نے چند عنوانات کے تحت مرزا کی کتابوں سے اور دوسرے ذرائع سے مفصّل اقتباس جمع کر دیے ہیں اور کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے مگر ان کی کتاب میں مرزا کی مسلسل اور مربوط سوانح عمری لکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔'' [21]

مصنف مالک رام نے بھی ۱۹۳۸ء میں مرزا غالبؔ کی سوانح عمری ''ذکرِ غالبؔ'' لکھی۔ مالک رام نے اس سوانح میں مواد تحقیق و جستجو سے حاصل کیا اور ساتھ ہی غالبؔ پر لکھی جانے والی تمام سوانح عمریوں سے مدد لی۔ سوانح کو تین حصوں میں تقسیم کیا پہلے حصے میں ممدوح کی نجی زندگی کا بیان، دوسرے حصے میں تصانیف کا ذکر اور تیسرے حصے میں مرزا کے کردار پر جزئیات نگاری کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، سوانح کا اسلوب ملاحظہ کیجیے:

> ''مرزا چونکہ ایک تازہ اور ولایتی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لیے ان کا چہرہ مہرہ خد و خال ابھی مسخ نہیں ہونے پائے تھے اور ان میں اپنی قوم کی جملہ خصوصیات موجود تھیں ان کی بڑی عمر کی تصویروں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے شباب میں نہایت حسین اور خوشرو تھے، چوڑا چکلا ہاڑ، لانبا قد، سڈول اکہرا جسم، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کھڑا نقشہ، چوڑی پیشانی، ناک کی کاٹھی اونچی، رخسار کی ہڈیاں نسبتاً ابھری ہوئی، گھنی لانبی پلکیں اور بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کان بڑے، سرخ و سفید رنگ، جس میں شراب نوشی سے چمپئی دمک پیدا ہو گئی تھی، شراب نوشی ہی کے باعث اخیر عمر میں پاؤں کی انگلیاں سوج کر اینٹھ گئیں تھیں جس سے چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی تھی جوانی میں داڑھی منڈواتے تھے اور سر پر پٹھے رکھتے تھے جب کہولت کا زمانہ آیا اور داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے تو داڑھی منڈوانا ترک کر دی کیونکہ دوسرے تیسرے سفید کھونٹی نکل آتی اور بدنما معلوم ہوتی تھی، داڑھی زیادہ لمبی مولویانہ طرز کی نہیں رکھتے تھے بلکہ کتُرواتے تھے یہ دو ڈھائی انگل سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، دہلی کے عوام کی وضع قائم تھی، منہ پر داڑھی سر پر بال، انہوں نے یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی جس دن داڑھی بڑھائی اس دن سر منڈایا، جوانی میں مسّی بھی استعمال کرتے تھے

جب سامنے کے دونوں دانت ٹوٹ گئے تو یہ بھی ترک کر دی، لمبا قد ہونے کی وجہ سے اخیر عمر میں کمر میں ذرا خم آ گیا تھا اور وہ جھک کر چلتے تھے۔'' ۲۲

''ذکرِ غالبؔ'' کے بارے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا کہنا ہے کہ:

''کسی سوانح عمری کے لیے محققانہ جستجو ایک لازمی بات ہے لیکن اگر پیش کش صحیح نہ ہو تو معلومات مواد سے آگے نہیں بڑھتی سوانح عمری کے لیے مواد کی ایسی ترتیب کی ضرورت ہے جو حسن اور دلچسپی دونوں کی ضامن ہو۔ مالک رام جستجو میں بھی کسی سے کم نہیں لیکن پیش کش میں، بہت کم لوگ ان تک پہنچ سکے ہیں، بہت سی صورتوں میں مالک رام نے دوسروں کی کاوش سے تسلی بخش فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر یہ کوئی عیب کی بات نہیں، انہوں نے ہمیں ایک ایسی قابلِ مطالعہ سوانح عمری دی ہے جو محققانہ بھی ہے اور مسرت بخش بھی ایک ہلکی پھلکی واضح مختصر مگر جامع سوانح عمری۔'' ۲۳

سیّد ابوالحسن ندوی نے ۱۹۳۹ء میں ''سیرت سید احمد شہید'' لکھی اس سوانح عمری میں مصنف نے تحقیق سے کام لے کر اس سوانح کو بخوبی مکمل کیا۔

علامہ اقبال کی سوانح عمری ۱۹۳۹ء ''سیرتِ اقبال'' طاہر فاروقی کی کاوش ہے یہ سوانح عمری ضخیم ہونے کے باوجود دلچسپ ہے۔

۱۹۴۰ء ''آثار جمال الدین افغانی'' سوانح عمری قاضی محمد عبدالغفار نے تحریر کرتے وقت ممدوح کے تمام بنیادی ماخذ اور ثانوی ماخذ کو مدِ نظر رکھا ہے اور خاص کر ممدوح کے بنیادی نقطۂ سیاست کے پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔

مذکورہ سوانحی ادب اردو کی اہم سوانح عمریاں ہیں ان کے سوانح نگار اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں انھوں نے سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں کو اپنی تحریروں میں سلیقے اور ہنر مندی سے برتا ہے۔

اسرار احمد آزاد نے ''سرخ چین کا رہنما'' سوانح عمری ۱۹۴۴ء میں لکھی یہ سوانح عمری مختصر ہونے کے باوجود مکمل سوانح ہے، مصنف نے اپنے ممدوح کے کردار کو واضح کرنے کے ساتھ چین میں آنے والے انقلاب کا ذکر بھی کیا ہے۔

''حیاتِ خسرو'' ۱۹۴۵ء میں محمد وحید مرزا نے لکھی۔ اس سوانح کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں امیر خسرو کی زندگی کے حالات قلمبند کیے اور دوسرا حصہ ان کی تصانیف کے حوالے سے ہے۔ اس سوانح میں تحقیقی رنگ غالب ہے اور سوانح نگار نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے۔

''قائدِ ملت'' ۱۹۴۶ء میں غلام محمد بی۔ اے نے بہادر یار جنگ کی سوانح عمری لکھی لیکن مصنف نے ان کا صرف ایک پہلو جو سیاست کے حوالے سے ہے، دکھایا ہے۔ اس لیے اس کو سوانح کے بجائے خاکہ کہیں تو بہتر ہے۔

''سراج الدولہ'' کی سوانح، محمد عمر نے ۱۹۴۶ء میں نے لکھی لیکن یہ سوانح سے زیادہ تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

''قائدِ اعظم محمد علی جناح'' کی سوانح عمری، خالد اختر افغانی نے ۱۹۴۶ء میں لکھی۔ جس میں اپنے ممدوح کی مدح سرائی اس طرح ہے کہ اس میں ان کے سیاسی حالات و واقعات بھرپور انداز سے بیان کیے ہیں جب کہ ان کی نجی زندگی کو بیان کرنے سے قاصر نظر آئے ہیں۔

حبیب اللہ خاں نے ''حیاتِ آفتاب'' ۱۹۴۷ء میں رقم کی، لیکن افسوس یہ بھی ممدوح کی مدح سرائی کا شاہ کار ثابت ہوئی۔

''محمد بن عبدالوہاب'' کی سوانح عمری مسعود عالم نے ۱۹۴۷ء میں لکھی۔ اس سوانح میں عبدالوہاب کا وہابی تحریک میں شمولیت کا بیان اور وہابی تحریک پر جو الزامات تھے انھیں تحقیقی دلائل کی روشنی میں دور کیا گیا ہے۔

رشید احمد ندوی کی سوانح عمری 'سیف اللہ' تاریخی نوعیت کی ہے، حضرت خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) کے جنگی واقعات کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے اس کے علاوہ سر ولیم

میور نے حضرت خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) پر جو الزام عائد کیے ان کی تردید کی ہے۔

۱۹۴۷ء تک کی سوانح عمریوں کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوانح نگاری میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ سوانح لکھنے میں تحقیق سے کام لیا گیا۔ حالی کی طرز کو اپناتے ہوئے مختلف سوانح نگاروں نے کام کیا اور اس میں جدیدیت کو اپناتے ہوئے کئی معروف و مشہور سوانح قلم بند کیں، اسی طرح شبلی کے طرزِ سوانح نگاری کو ان کے شاگردوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ اپناتے ہوئے آگے بڑھایا۔

مغربی طرز کی سوانحِ عمریاں لکھنے کے لیے، بہت سے سوانحِ نگاروں نے آواز اٹھائی کہ سوانح طوالت اور ضخامت کے بجائے مختصر اور جامع ہو، ان میں قابل ذکر نام شیخ محمد اکرام کا ہے۔

حالی اور شبلی کے بعد اس صنف میں نئے تجربات ہوئے اور سوانح نگاری نے ترقی کر کے ادب کا دامن قیمتی سوانح عمریوں سے وسیع کر دیا ہے۔

(ج) سوانحِ نگاری، آزادی کے بعد

آزادی سے قبل سوانح عمریوں کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر سوانح سیاسی، لسانی اور مذہبی حوالے سے لکھی گئیں تھیں۔ سوانح نگار حالی اور شبلی کے پیروکار نظر آتے ہیں کچھ سوانح نگاروں نے سوانح نگاری کے نو وضع کردہ اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بہترین سوانح عمریاں بھی تخلیق کیں۔

آج مغرب میں سوانح نگاری بہ حیثیت صنفِ ادب کے مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہے جب کہ ہمارے یہاں ابھی تک وہ درجہ حاصل نہ کر سکی ہمارے سوانحِ نگار ممدوح کی سوانح لکھتے ہوئے اس کا تقابل پیش نہیں کرتے بلکہ ممدوح کی پیدائش سے وفات تک کے حالات جوں کہ توں بیان ہوتے ہوئے اُس کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو بھی رقم کرتے ہیں جس میں وہ کبھی ممدوح کی مدح سرائی کرتے نظر آئے تو کبھی غیر جانبداری سے واقعہ نگار نظر آتے ہیں۔

اب ایسا نہیں ہے، آج کا سوانح نگار اپنے ممدوح کی تصویر میں مصور کی طرح رنگ بھرتے ہوئے مستند معلومات سے اُسے جامع، مختصر اور دلچسپ بناتا ہے۔ جدید دور کی سوانح عمریوں میں ممدوح کی شخصیت کو جس خوب صورتی سے ابھارا جاتا ہے پہلے کے دور میں یہ رواج نہ تھا جس کی وجہ سائنس کی ترقی ہے۔

سوانح نگاری کے ابتدائی دور میں سوانح نگاروں نے حالیؔ اور شبلیؔ کی تقلید میں سوانح عمریاں لکھیں، بعد کے دور میں سوانح نگاروں نے جدید رنگ کو اختیار کیا اور سوانح عمریوں کے مواد میں خطوط، روزنامچوں اور ذاتی ملاقاتوں کے احوال کی شمولیت نے اہم کردار ادا کرنا شروع کیا لیکن ان سوانح عمریوں کو بھی ادب میں کوئی خاص مقام حاصل نہ ہوسکا، ان سوانح عمریوں کے بارے میں قاضی عبدالغفار کا کہنا ہے کہ:

> ''میں خود تو ایسی سوانحِ نگاری کا قائل ہی نہیں جس کی اساس زندگی کے صرف ایسے واقعات ہوں کہ کب پیدا ہوئے، کس کے بیٹے تھے، کہاں تک تعلیم پائی، کیا کیا کام کیے، قومی لیڈر تھے تو قوم کی کیا خدمت کی، عالم وفاضل تھے تو علم وفضل میں مقام کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔''[۲۴]

جدید سوانحِ نگار کے لیے یہ بات انتہائی اہم ہے کہ وہ ممدوح کی حیات کے پس و پیش کو تمام تر سماجی اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور مذہبی نظریات کے تناظر میں اس طرح غیر جانبدارانہ حقائق کی کسوٹی پر پرکھے کہ سوانح کو سند اعتبار حاصل ہوسکے۔

مولانا عبدالسلام ندوی ایسے ہی سوانحِ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں، اپنی تصنیف ''اقبالِ کامل'' ۱۹۴۸ء کے متعلق کہتے ہیں:

> ''ان کا کلام خشک فلسفیانہ مسائل کا مجموعہ نہیں ہے یعنی وہ صرف ناظم نہیں ہیں بلکہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں، اس لیے میں نے فلسفیانہ، صوفیانہ اور سیاسی مسائل سے پہلے ان کی ذات کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے پیشِ

نظر رکھا ہے اور مختلف عنوانات میں ان کی شاعرانہ حیثیت کو زیادہ مکمل صورت میں نمایاں کیا ہے۔'' ۲۵

علامہ اقبال پر عبدالسلام ندوی سے پہلے بہت کم لوگوں نے لکھا، انھوں نے مواد اخبار اور رسالوں سے حاصل کیا اس پر وہ کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کے سوانح و حالات پر اگر چہ کوئی مکمل رسالہ، کوئی مکمل کتاب نہیں لکھی گئی تاہم انہیں میں اس کا مواد اس کثرت سے موجود ہے کہ ان کو پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کے سوانح و حالات کو مکمل صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔'' ۲۶

قاضی عبدالغفار نے ''آثار ابوالکلام آزاد'' ۱۹۴۹ء میں لکھی یہ سوانح عمری منفرد اسلوب میں تھی جس میں سوانح نگار نے ممدوح کی شخصیت کو سرسری انداز میں بیان کیا اور ان کے ہم عصر لوگوں کو ان سے کم حیثیت کے ثابت کرنے کی کوشش کی اس کے باوجود یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی بہترین سوانح عمری میں شمار ہوتی ہے۔

عبدالسلام ندوی کی سوانح عمری ''امام رازی'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ:

''جس طرح مولانا شبلی مرحوم نے ''الغزالی'' میں فلسفہ و کلام کے متعلق امام غزالی کے خیالات و نظریات کی تشریح کی ہے، اسی طرح امام رازی کے خیالات و نظریات کی بھی تشریح کی ضرورت تھی اور یہ کتاب اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔'' ۲۷

۱۹۵۰ء میں لکھی جانے والی سوانح عمری ''حیاتِ اجمل'' بھی قاضی عبدالغفار کی تخلیق ہے جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

''اس کتاب کی ترتیب میں، جو سوانح حیات بھی ہے اور ایک حد تک

ہندوستان کے ایک دور کی سیاسی تاریخ بھی، میں نے تاریخی واقعات کے چوکھٹے میں حکیم صاحب کی تصویر اس طرح لگائی ہے کہ جو کوئی ان کی زندگی کے حالات پڑھے وہ اس زمانے کے سیاسی ماحول سے بھی واقف ہوتا جائے۔''[28]

سوانح نگار نے حکیم اجمل کی زندگی میں پیش آنے والے حالات وواقعات کو احسن طریقے سے بیان کیا اور ان کے سیاسی کاموں کو تفصیل کے ساتھ بتایا حکیم صاحب کی شخصیت میں محبت اور خدمت کے جو جذبے کارفرما ہیں ان کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

''سب سے بڑی وراثت جو حکیم محمود خاں نے اپنی اولاد اجمل خاں کے لیے چھوڑی وہ صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی ایک ''اخلاقِ انسانی اور جذبہ خدمت'' دوسرے ''اپنے فن سے محبت''۔''[29]

''یادگارِ حالی'' سوانح عمری ۱۹۵۰ء میں صالحہ عابد حسین نے مولانا الطاف حسین حالی پر لکھی۔ صالحہ عابد حسین رشتہ میں حالی کی نواسی ہیں، اسی محبت وعقیدت کے جذبے کے تحت ان کی تمام تحقیق مستند ہے۔ جس کا مواد انہوں نے اپنے قریبی عزیزوں سے حاصل کیا۔ اس سوانح کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ہے کہ:

''خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی کے لیے اس سے زیادہ مستند ذریعہ علم اور کیا ہوسکتا ہے۔''[30]

یہ حالی پر لکھی جانے والی پہلی سوانح عمری ہے۔

پریم چند کی سوانح عمری، ہنس راج رہبر نے ۱۹۵۰ء میں لکھی اس میں سوانح نگار نے ممدوح کی زندگی کے ان پہلوؤں کو روشن کیا جن سے ان کی تصانیف کو باآسانی سمجھا جاسکے۔

غلام رسول مہر نے ''سیرتِ سیّد احمد شہید'' کے نام سے ان کی سوانح عمری ۱۹۵۱ء میں لکھی یہ سوانح دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد میں ممدوح کے سوانحی حالات کو بڑے طریقے سے بیان کیا

گیا ہے اور دوسری جلد میں جہاد، جنگوں اور ان کی موت کا بیان بڑے تسلسل سے کیا گیا ہے۔

''حیاتِ اکبر'' ۱۹۵۱ء میں عشرت حسین نے تحریر کی اور مُلا واحدی نے اسے ترتیب دیا یہ اکبر الٰہ آبادی کی سوانح ہے لیکن سوانح سے زیادہ خاکہ محسوس ہوتا ہے کیونکہ مواد کو مکمل شکل نہیں دی گئی جس کے بارے میں عبدالماجد دریا آبادی کا کہنا ہے کہ:

> ''یہ مسودہ حیاتِ اکبر کے ایک اچھے خاکہ کا کام تو کم سے کم دے ہی سکتا ہے یہ اور بات ہے کہ اب بھی یہ ناقص ہے، ناتمام ہے، تشنہ ہے اور حیاتِ اکبر جس شان سے دیکھنے کو جی چاہتا ہے اس کی طرف یہ رہبری ہی کر سکتا ہے اور بس۔'' [۳۱]

ظ۔ انصاری نے ۱۹۵۱ء میں جارج برنارڈ شاہ کی سوانح عمری مرتب کی جس میں ان کے حالاتِ زندگی اور تصانیف کے ذکر کے ساتھ کچھ ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا ہے تاکہ قاری کو ان کے فن سے واقفیت حاصل ہو اس کے علاوہ سوانح نگار نے انگریزی کتب سے مواد اکٹھا کر کے برنارڈ شاہ کی پہلی اردو سوانح لکھی ہے۔

''بیدل'' کی سوانح عمری ۱۹۵۲ء میں خواجہ عباداللہ اختر نے لکھی جس میں بیدل کے کلام کو موضوع بنایا ہے اور ممدوح کے حالاتِ زندگی بھی ان کے کلام سے اخذ کیے ہیں اس میں بہ حیثیت شاعر بیدلؔ کو غالبؔ پر فوقیت دی گئی ہے۔

عبدالماجد دریا آبادی نے ''حکیم الامت، نقوش و تاثرات'' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں مولانا اشرف علی تھانوی کی سوانح عمری لکھی عبدالماجد دریابادی کا شمار جدید سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہ مولانا شبلی کے شاگردوں میں سے تھے سوانح عمری خطوط اور ذاتی تاثرات پر مبنی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا شمار علما اور صوفیا کرام میں ہوتا ہے، وہ حکیم الامت کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی کی ایک اور سوانح عمری ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' یہ سوانح

دو جلدوں میں شائع ہوئی پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں آئی اور دوسری جلد ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی، وہ اس سوانح میں لکھتے ہیں:

"مجھے ان سے شرف نیاز وسط ۱۹۱۲ء سے ان کی آخری عمر یعنی ختم ۱۹۳۰ء تک کہنا چاہیے کہ ۱۷۔۱۸ سال کی مدت تک رہا، آئندہ صفحات میں نے اپنے اتنے دن کے تاثرات و مشاہدات کو یکجا اور قلم بند کر دینے کی کوشش کی ہے ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بلکل الگ چیز ہے، کوئی صاحب اس ذاتی ڈائری کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمالیں۔" ۳۲

یہ سوانح ذاتی تاثرات اور یادداشتوں پر مشتمل ہے لہٰذا اسے مرقعوں میں شمار کیا جائے تو بہتر ہے۔

۱۹۵۵ء میں "ذکرِ اقبال" سوانح عمری عبدالماجد سالک نے لکھی یہ سوانح علامہ اقبال پر تحریر کی جانے والی پہلی باضابطہ سوانح ہے کیونکہ اقبال کے فلسفہ اور تصانیف کے حوالے سے تو متعدد مضامین دستیاب تھے لیکن ان کی شخصیت کے پہلو نمایاں نہیں تھے۔ عبدالماجد سالک، اقبال کے شاگرد اور دوستوں میں شمار ہوتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے ممدوح کی کردار نگاری غیر جانبدار انداز میں پیش کی ہے، اس سوانح عمری کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ کیجیے:

"مجھے خود بھی چوتھائی صدی تک براہ راست علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا اور علامہ کے احباب اعزا، مداحین اور ملاقاتیوں سے بھی شناسائی رہی، اس لیے مجھے رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ علامہ کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر اب تک کماحقہ روشنی نہیں ڈالی گئی لیکن وہ پہلو یقیناً ایسے ہیں جو اہل علم کی نظروں سے رہنے چاہیں۔" ۳۳

سوانحِ نگار ابو سعید قریشی نے سعادت حسن منٹو کی سوانح عمری "منٹو" ۱۹۵۵ء میں تحریر کی۔ سوانح میں ابو سعید قریشی نے منٹو کو تخلیقات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اور اپنے ممدوح سے ذاتی

ملاقاتوں کا ذکر خوبی وخامی سمیت سوانح میں سمودیا ہے۔

''سوانح عمری خواجہ حسن نظامی'' ملا واحدی نے ۱۹۵۷ء میں رقم کی۔ ملا واحدی صاحب اسلوب سوانح نگار ہیں۔انہوں نے ممدوح کی شخصیت کو محبت وعقیدت کے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے ان کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کا بیان اصلاحی انداز میں قلم بند کیا ہے۔جن کے بارے میں ان کا بیان ہے:

> ''حضرت خواجہ صاحب اور واحدی صاحب کے تعلقات کی عمر تقریباً پچاس سال ہے اور یہ پچاس سالہ تعلق بہت قریب کا تعلق تھا، ایسا کہ واحدی صاحب ان کے دست راست اور رفیق بھی تھے، مرید بھی تھے اور بے تکلف دوست وناقد بھی۔'' ۳۴

شبلی کی رائے میں سوانح نگار:

> ''مورخ کی تحریر ایسی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والا محسوس نہ کرے کہ یہاں لکھنے والے کی تیوری چڑھی ہے اور یہاں لکھنے والے کا چہرہ کھل گیا ہے۔'' ۳۵

شورش کاشمیری نے ۱۹۵۸ء میں مولانا ظفر علی خاں کی سوانح عمری لکھی، شورش کاشمیری نے یہ سوانح محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی اور ممدوح کے اپنے زمانے میں پیش آنے والے حالات وواقعات کا بیان ہے کہ وہ ان حالات سے کس طرح نبرد آزما ہوئے، لیکن یہ سوانح بھی خاکہ کے زمرے میں ہی آتی ہے۔

شفیع عقیل نے ۱۹۵۸ء میں مجید لاہوری کی سوانح تحریر کی۔ شفیع عقیل کی یہ سوانح ان کی غیر جانبداری کا مظہر ہے۔انہوں نے ممدوح کی شخصیت کو مکمل طور پر واضح کرنے کی کوشش نہیں کی، سوانح میں انہوں نے مجید لاہوری کے کلام پر تبصرہ بھی پیش کیا ہے۔

محمد یوسف نے ''امام ابن تیمیہ'' ۱۹۵۹ء میں لکھی۔ سوانح نگار نے ممدوح کے حالاتِ زندگی

تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں لیکن سوانح میں تحقیقی رنگ غالب ہے اور دلچسپی کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔

۱۹۶۰ء میں مولوی عبدالحق نے سر سیّد احمد خاں کی سوانح عمری ''سر سید احمد خاں، حالات و افکار''، قلم بند کی مولوی عبدالحق نے سر سید احمد خاں کے ساتھ کافی وقت گزارہ ہے جس بنا پر انہوں نے ان شخصیت کو بڑے قریب سے دیکھا اور پرکھا۔ اس کے علاوہ سر سید احمد خاں کے کاموں اور خدمات کا ذکر بھی تنقیدی انداز میں پیش کیا ہے۔

چودھری سردار محمد خاں عزیز نے ۱۹۶۲ء میں ''حیاتِ قائدِ اعظم''، لکھی۔ یہ سوانح قائدِ اعظم کی شخصیت سے زیادہ اُن کی سیاسی زندگی کی عکاس ہے۔

''مولانا محمد علی'' سوانح عمری ۱۹۶۲ء میں محمد سرور نے تحریر کی، سوانح نگار ممدوح کی ذاتی زندگی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہیں، محمد علی کی مذہبی سیاسی اور صحافتی حوالے سے مواد بہتر ہونے کی بنا پر یہ حصہ خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

محمد ایوب قادری نے ۱۹۶۳ء میں ''مخدوم جہانیاں گشت'' کی سوانح عمری لکھی لیکن یہ سوانح سے زیادہ تحقیقی مقالہ معلوم ہوتا ہے۔ ممدوح کے سوانحی حالات کے ساتھ سوانحِ نگار نے ان کی زندگی کے متعلق حالات و واقعات کے بیان کے علاوہ ممدوح کی زندگی سے جو بے بنیاد باتیں منسوب ہوگئیں تھیں ان کی بھی تردید کی ہے۔

محمود علی خاں جامعی نے جگر مراد آبادی کی سوانح عمری ''تذکرہ جگر'' ۱۹۶۳ء میں لکھی محمود علی خاں جگر مراد آبادی کے دوست ہونے کے سبب اور ان سے محبت وعقیدت کے باعث ان کی زندگی کے صرف ان پہلو کو متعارف کروایا ہے جن کو پڑھ کر ان کے کلام کو سمجھا جا سکے، اس سوانح پر مصنف کی رائے ملاحظہ کیجیے:

> ''اس کتاب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جگر کی نجی زندگی اور کردار کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے جن سے ان کے کلام کی نوعیت یا خصوصیت پر

روشنی پڑتی ہے یا اسے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔"[۳۶]

خلیق احمد نظامی نے ۱۹۶۴ء میں "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" تحریر کی یہ سوانح بڑی تفصیلی ہے سوانح نگار نے اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ میں ابواب کی درجہ بندی کی اور شیخ صاحب کی ذاتی زندگی، علمی ادبی خدمات، تصانیف اور ہم عصروں کا تذکرہ خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

۱۹۶۴ء میں سید محمد الحسنی نے "سیرت محمد علی مونگیری" لکھی سوانح نگار نے اپنے ممدوح حضرت مونگیری کی شخصیت و کردار کو بہت خوب تحریر کیا ہے، ان کا سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے اُس کا بیان بھی کیا گیا ہے۔

۱۹۶۵ء میں سوانح "مولانا عبدالقادر رائے پوری" کو ابوالحسن علی ندوی نے لکھا اس سوانح عمری میں ابوالحسن ندوی نے ممدوح کی روحانیت اور دینی کاموں کا ذکر بڑے تفصیلی انداز میں کیا ہے۔

خورشید مصطفےٰ رضوی نے ذاکر صاحب کی سوانح عمری "حیاتِ ذاکر حسین" ۱۹۶۹ء میں تحریر کی ذاکر صاحب پر یہ سب سے مستند سوانح عمری قرار دی جاتی ہے سوانح نگار نے اس سوانح میں ممدوح کی مکمل شخصیت کو واضح کیا ہے۔

"حیاتِ عبدالحیٔ" سوانح عمری بھی ابوالحسن علی ندوی نے ۱۹۷۰ء میں تحریر کی یہ سوانح انہوں نے اپنے محترم والد صاحب کے کہنے پر لکھی ہے، اس سوانح عمری کے بارے میں سوانح نگار کا خیال ہے:

> "اگر یہ سوانح سالہا سال پہلے مرتب کر لی جاتی جب ناچیز مصنف کا ولولۂ تصنیف تازہ، قلم جواں اور رواں اور بصارت صحیح اور محفوظ تھی تو ذرا بھی تعجب کی بات نہ ہوتی اس وقت ایسے بھی لوگ موجود تھے جن سے بہت سی ضروری معلومات اور چشم دید واقعات مہیا ہو سکتے تھے۔"[۳۷]

سوانح نگار نے اس سوانح میں سوانح عمری کے تمام اصولوں کو اپناتے ہوئے مستند معلومات کے ساتھ جدید سوانح عمری منضبط کی اور ممدوح کی شخصیت کو ہو بہو تراشا ہے تا کہ قاری کو پڑھتے ہوئے اس میں مبالغہ محسوس نہ ہو۔

سوانح نگار کا کہنا ہے:

> ''علوم دینیہ اور مدارس عربیہ کے طلبہ سے لے کر ملک کے ممتاز فضلا، اہلِ قلم و مصنف اور ملک و ملت کے خادموں اور قائدین کے لیے اس میں بصیرت و عبرت اور ذکر و مواعظت کا بڑا سامان ہے۔''[۳۸]

''غالب اپنے آئینہ میں'' سوانح نگار اختر صدیقی نے غالبؔ کی یہ سوانح عمری ۱۹۷۰ء میں لکھی یہ سوانح عمری سے زیادہ غالبؔ پر تنقیدی کتاب معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوانح نگار نے غالبؔ کی تمام منفی باتوں کو بیان کیا ہے۔

۱۹۷۲ء میں شاہ معین الدین احمد ندوی نے سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری ''حیاتِ سلیمان'' لکھی شاہ معین احمد ندوی سید سلیمان کے ہونہار شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنے استادِ محترم کی سوانح عمری غیر جانبداری کے ساتھ تحریر کی۔ سوانح کے مواد کے لیے شاہ معین الدین نے استادِ محترم کی صحبتوں اور تصانیف سے فائدہ اٹھایا اور سوانح کو جدید تاریخی اصولوں کے انداز میں رقم کیا ہے۔

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر محمد صادق نے ''محمد حسین آزاد، احوال و آثار'' کے نام سے سوانح عمری لکھی اس سوانح کا مقصد محمد حسین آزادؔ کی شخصیت و کردار کو سامنے لانا تھا لیکن اس سوانح کا اسلوب تنقیدی ہے۔

اب تک جن سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا ہے وہ اپنے دور کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار ہوتی ہیں ان سوانح عمریوں میں کچھ جدید رجحان پائے گئے کچھ حالؔی اور شبلؔی کی تقلید میں لکھی گئیں کچھ سوانح نگاروں نے ممدوح کی شخصیت و کردار پر بھرپور توجہ دی تو کسی سوانح نگار نے ان کے

کارناموں یا علمی ادبی خدمات کو موضوع بنایا ان میں کچھ سوانح مختصر بھی پائی گئیں اور کچھ طویل بھی کچھ عقیدت واحترام میں لکھی گئیں۔

ان کے علاوہ سیاسی رہنما، مذہبی رہنما، علمی وادبی رہنماؤں اور مشاہیر پر بھی بڑی تعداد میں سوانح لکھیں گئیں، ان تمام سوانح عمریوں نے اپنے اپنے طور پر شہرت ومقبولیت کے آسمان کو چھوا۔

علمی وادبی، سماجی وسیاسی سوانح عمریاں جس دور میں زیادہ تعداد میں لکھیں گئیں وہ دور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۶ء تک کا دور ہے، اس دور یا زمانے میں بہت سے سوانح نگاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیابی کے ساتھ سرخرو ہوئے اور اپنے ممدوح کی شخصیت کو بہت شاندار انداز میں اپنے قاری سے متعارف کرایا، جس سے سوانح اور ممدوح کی توقیر میں اضافہ ہوا۔

آزادی کے بعد لکھی جانے والی سوانح عمریوں میں اس دور کی تحریکِ آزادی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ سوانح نگاروں نے مغربی ادب سے استفادہ کر کے جدیدیت کو اہمیت دی اور باقاعدہ طور پر سوانحِ نگاری کے اصولوں کو مرتب کر کے سوانح میں شامل کیا اور سوانحی صنف کو ادب میں کامیاب اور منفرد بنانے کے لیے کوشاں رہے۔

ناقدین نے سوانحِ نگاروں کے بارے میں اپنی تنقیدی آرا کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا ہے۔ مختلف سوانح نگاروں کے موضوعات کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سوانح نگاروں نے اپنے اسلوب، سوچ وفکر، ذہنی اپج اور پسند وناپسند کے لحاظ سے الگ راہیں نکالی ہیں۔ جن کی بدولت جہاں بعض شخصیتوں کی حیات وخدمات کے مخفی پہلو بھی سامنے آتے ہیں، وہاں ان کے ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک مکمل اور بھرپور تاثر آئینہ ہو جاتا ہے۔ سوانحِ نگاری میں مشاہدہ، حقیقت اور اسلوب کی شگفتگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ساتھ ہی مردم شناسی کا جوہر اور نفسیاتی آگاہی کو ایک اچھے سوانحِ نگار کی بنیادی خوبی مانا جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری، ص ۹
۲۔ ایضاً
۳۔ محولہ بالا، ص ۱۱۲
۴۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، ص ۳۳۳
۵۔ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب کے خطوط (جلد اوّل)، ص ۱۲۵
۶۔ شاہ معین الدین ندوی، حیات سلیمان، ص ۴
۷۔ سید سلیمان ندوی، حیات مالک، ص ۱
۸۔ محولہ بالا، ص ۳۳
۹۔ سید سلیمان ندوی، رحمت عالم، ص ۱۱
۱۰۔ سید سلیمان ندوی، خیام، ص ۱
۱۱۔ شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، ص ۷
۱۲۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۱۰
۱۳۔ محولہ بالا، ص ۴۶۶
۱۴۔ آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، ص ۲۲۳
۱۵۔ اسلم جیراج پوری، حیات جامی، ص ۲
۱۶۔ مولانا عبدالسلام ندوی، سیرتِ عمر بن عبدالعزیز، ص ۳
۱۷۔ اکرام اللہ ندوی، وقارِ حیات، ص ۴۰۳
۱۸۔ غلام رسول مہر، غالب، ص ۷
۱۹۔ غلام رسول مہر، سیرت امام ابن تیمیہ، ص ۱
۲۰۔ ڈاکٹر سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری، ص ۲۸۹
۲۱۔ شیخ محمد اکرام، غالب نامہ، ص ۹
۲۲۔ مالک رام، ذکرِ غالب، ص ۱۵۸

۲۳۔ سید عبداللہ، میر امن سے عبدالحق تک، ص ۲۲۸
۲۴۔ قاضی عبدالغفار، آثار ابوالکلام آزاد، ص ۱۰
۲۵۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص ۴
۲۶۔ محولہ بالا، ص ۳
۲۷۔ عبدالسلام ندوی، امام رازی، ص ۲
۲۸۔ قاضی عبدالغفار، حیات اجمل، ص ۵
۲۹۔ قاضی عبدالغفار، حیات اجمل، ص ۱۸
۳۰۔ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، ص ۱۳
۳۱۔ سید عشرت حسین، ملا واحدی (ترتیب)، حیات اکبر، ص ۱۳
۳۲۔ عبدالماجد دریابادی، محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق، ص ۱
۳۳۔ عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، ص ۳
۳۴۔ ملا واحدی، سوانح عمری خواجہ حسن نظامی، ص ۷
۳۵۔ محولہ بالا، ص ۱۵، ۱۶
۳۶۔ محمود علی خاں جامعی، تذکرہ جگر، ص ۱۲
۳۷۔ ابوالحسن علی ندوی، حیات عبدالحئی، ص یا پیش لفظ
۳۸۔ محولہ بالا

☆☆

''پتھر نصب کرنے سے نسب اور نصیب نہیں بدلا کرتے۔''

''ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان گفتار میں فرد اور کردار میں مرد۔''

''بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے جاتے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔''

یہ جملے قافیہ پیمائی کا حسین امتزاج ہیں اور اقوالِ زریں کا درجہ رکھتے ہیں۔''

مختار مسعود کی نثری خدمات

(الف) ادبی سرمایہ

مختار مسعود عہدِ حاضر کی ایک سر برآوردہ ادبی شخصیت ہیں جن کا سکہ اردو نثر میں رواں ہے جس کا اعتراف اس عہد کے معتبر اور غیر جانبدار اہلِ دانش کھلے دل سے نقد ونظر کی کسوٹی پر کرتے ہیں۔

شہنشاہ لفظیات حضرت جوشؔ ملیح آبادی رقمطراز ہیں:

> ''اردو کا تمام نثری سرمایہ میری نگاہ میں ہے اور اس بنا پر بلا خوفِ ابطال یہ بات دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کی جہاں تک کہ الفاظ کی برمحل نشست، ابلاغ کی بے نظیر صلاحیت اور طرزِ بیان کی بے مثال ندرت کا تعلق ہے مختار مسعود صاحب ایک جدید طرزِ انشا کے موجد ہیں۔'' [1]

ممتاز ادیب، محقق اور نقاد ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''مختار مسعود کے اسلوب میں بلا کی روانی ہے۔ حروف لفظوں میں، لفظ سطروں میں اور سطریں ایک دوسرے میں اس تیزی کے ساتھ مدغم ہوتی ہیں کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے اسے پر عطا ہو گئے ہوں۔ ہر آٹھ دس سطروں کے طوفانی بہاؤ کے بعد کوئی نہ کوئی مزیدار اور معنی خیز فقرہ ضرور آجاتا ہے۔'' [2]

وہ شاعر نہیں تھے ایک کہنہ مشق نثر نگار تھے ان کا شمار نثر کے محتاط قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی زبان سند کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے کم لیکن بہت عمدہ لکھا۔ زبان و بیان اور انشاء وقواعد کا خیال بدرجہ اتم رکھا کہ قلم سے کوئی لفظ یا محاورہ ایسا نہ نکل جائے جس کی صحت اور صنعت کی بابت انھیں پکا یقین نہ ہو یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر نہ صرف پُر کشش بلکہ اس کا ہر لفظ ان کی زبان پر

قدرت کی دلیل ہے۔ مختار مسعود گلشنِ نثر کے ایک ایسے شجر سایہ دار ہیں جس کی بوقلمونی نے شجرِ نثر کے ہر گلِ رعنا کو دلکش روپ بخشا اور اس کی جڑیں گلشن کی ہر روش تک پھیلی ہیں۔ مختار مسعود اُن چند خوش نصیب ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے بہت جلد شہرت کی بلندیوں پر قدم رکھا۔ ان کی نثر موضوعات، کردار، منظر نگاری، مکالمہ، فلسفہ و تاریخ، سماجی و سیاسی، تشبیہات و استعارات غرض ہر اعتبار سے مرصع ہے نہ وہ کسی کے مقلد ہیں اور نہ ان کی تقلید کی جاسکتی ہے۔

انہوں نے کبھی صاحبِ تصنیف ہونے پر نہ دھیان دیا اور نہ ہی اس دوڑ میں شامل ہوئے جس میں ان کے بیشتر ہم عصر مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں حرف کی سچائی اور بات کی اثر انگیزی کا مکمل یقین تھا۔ چار طبع زاد، دو مدون تصانیف اور کچھ غیر مدون تخلیقات مختار مسعود کا ادبی سرمایہ ہیں۔

ا...... ''آوازِ دوست''

مختار مسعود کی پہلی تصنیف جنوری ۱۹۷۳ء میں منصۂ شہود پر آئی جس کا نام انہوں نے مولانا جلال الدین رومیؒ کے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ کیا ہے:

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجامی آید ایں آوازِ دوست!

انتساب مختار مسعود نے ''پرِ کاہ'' اور ''پارۂ سنگ'' کے نام کیا ہے وہ ''پرِ کاہ'' جو والدہ شاہ بیگم مرحومہ کی قبر پر اُگنے والی گھاس کی پہلی پتی تھی اور وہ ''پارۂ سنگ'' جو والد شیخ عطا اللہ مرحوم کا لوحِ مزار ہے۔ ''آوازِ دوست'' دو مضامین ''مینارِ پاکستان'' اور ''قحط الرجال'' کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی شہرت و مقبولیت کے حوالے سے سید تاثیر مصطفیٰ رقمطراز ہیں:

''علمی حلقوں اور نوجوان نسل میں تہلکہ مچا دینے والی یہ کتاب ''آوازِ دوست'' تھی، جس کے مصنف کی اس وقت تک وجہ شہرت تصنیف و تالیف

یا تحریر و تقریر نہیں تھی۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار، بہترین منتظم اور دیانت دار افسر کی شہرت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی کتاب نے علمی و ادبی حلقوں میں تہلکہ مچادیا تھا۔ نظریاتی مباحث کے اس پُر جوش دور میں اس کتاب کا حوالہ اور اس پر گفتگو لازمی ہوگئی تھی۔ کتاب پہلے پاکستان، پھر ہمسایہ ملک بھارت اور ساتھ ہی دنیا بھر کے اردو پڑھنے لکھنے والوں میں تیزی سے مقبول ہوئی۔'' [۳]

مضمون ''مینارِ پاکستان'' [۴] میں ان مراحل اور سیاسی خواہشوں کو تحریکِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے پس منظر میں جس خوب صورتی سے قلم بند کیا گیا ہے وہ مختار مسعود کے مشاہدے فہم و فراست اور دور بینی کا بھی بین ثبوت ہے جن ایام میں مختار مسعود کمشنر لاہور کے فرائض انجام دے رہے تھے انہی دنوں ''مینار'' کی تعمیر ابتدائی مراحل میں تھی اور بہ حیثیت کمشنر مینار کی تعمیراتی کمیٹی کی سربراہی بھی ان کے فرائض میں شامل تھی۔ ابتدائی ایام میں مینار کو ''یادگارِ پاکستان'' کے نام سے موسوم کیا گیا لیکن مختار مسعود نے ''یادگار'' کا لفظ بدل کر ''مینارِ پاکستان'' رکھ دیا کیوں کہ ''یادگار'' کا لفظ موت اور فنا کا تصور پیش کرتا ہے اس مضمون کو تحریکِ آزادی کا نقیب بھی کہا جاسکتا ہے۔

''آوازِ دوست'' کا دوسرا مضمون ''قحط الرجال'' ان شخصیات کے خاکوں اور تذکروں پر مشتمل ہے جن کے دستخط انہوں نے اپنی آٹوگراف البم [۵] میں دورانِ طالبِ علمی سے محفوظ کرنا شروع کردیے تھے یہ تمام معتبر ہستیاں اپنے شعبوں میں نمایاں مقام رکھتی تھیں۔

شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی کتاب ''آوازِ دوست'' کے بارے میں ممتاز شاعرہ ادا جعفری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''آوازِ دوست'' کی مقبولیتِ عام کی ایک وجہ وہ دردِ مشترک ہے جو مصنف نے واضح طور پر محسوس کیا اُس درد کو الفاظ کا پیرہن عطا کیا جو خود قاری کے

یہاں، کہیں محسوس اور کہیں غیر محسوس انداز میں، بہر حال موجود تھا کہ اس
کتاب میں پاکستان کے دل کی دھڑکنیں شریک ہیں۔''۷

''قحط الرجال'' کے کُل تیرہ خاکوں میں پہلا محمد ابراہیم شا کیوچن ہے اور آخری قائدِ اعظم محمد علی جناح کا ہے۔ ان خاکوں سے ان اقدار کی شناسائی ہوتی ہے جو اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں۔

''آوازِ دوست'' جس میں ان کا مضمون ''قحط الرجال'' شامل ہے اپنے اسلوب، موضوع اور اثر پزیری کے سبب کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔

۲...... ''سفر نصیب''

''سفر نصیب'' ان کی دوسری تخلیق ہے جو جنوری ۱۹۸۱ء میں شائع ہو کر مقبول ہوئی اور تا حال کئی بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے اس میں کُل چار مضامین شامل ہیں۔ ہر حصہ دو مضمون پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب انہوں نے ''تارِ نفس'' اور ''خطِ جادہ'' کے نام کیا ہے۔

اس انتساب کے رموز کو بیان کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہے کہ:

''سفر اور حضر کی تفریق غلط، جادہ و منزل کی تقسیم بیکار، مسافر اور مقیم کا فرق محض فریب۔ راہ، خود سفر میں ہے، منزل، خود مقصود کی تلاش میں ہے، سکون، بھی ایک مسافر ہے۔ بہت سے مسافر ایک دوسرے پر سوار بہ یک وقت مختلف سمتوں میں سرگرمِ سفر ہیں۔ ایک سفر سے دوسرا سفر یوں پیوست ہے جیسے ایک روشنی دوسری روشنی سے مل کر روشن تر۔''۸

(i) ''برف کدہ''۔

یہ مضمون پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی جنت نظیر وادیوں، دلکش نظاروں اور پُر جوش چشموں، سرمئی جھیلوں کے دلکش نظاروں پر خوب صورت سفر نامہ ہے یہ سرکاری سفر اسلامی ممالک کے

سربراہوں کی کانفرنس میں شریک معزز شرکا کے لیے تھا۔

(ii) ''پس انداز''۔

یہ خاکہ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں شعبہ معاشیات کے صدر اور اپنے ہر دل عزیز استاد پروفیسر ڈاکٹر لودھی کریم حیدر (ایل کے حیدر) کے فضائل پر بڑی عرق ریزی اور دل جمعی سے لکھا ہے اور ان اداروں کا ذکر کیا جن سے ڈاکٹر صاحب اپنی تدریسی اور دیگر کارِ سرکار سے گزرے اور بعدازاں پاکستان ہجرت کا تذکرہ زبان اسلوب کے لحاظ سے متاثر کن اور بھرپور خاکہ ہے۔

(iii) ''طرفہ تماشا''۔

حصہ دوم کا پہلا مضمون بھی سفرنامہ ہی ہے جو ان اسفار کی یادوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنے شوق سیاحت کی تسکین کے لیے کیے تھے۔ انہوں نے جن ملکوں میں بھی قیام کیا ان کا ایسا منظر پیش کیا ہے جس میں قاری محو ہو جاتا ہے اُسلوب سہل اور رواں ہے۔

(iv) ''زادِ سفر''۔

دوسرا مضمون ''ڈاکٹر فضل الرحمان'' کا خاکہ ہے فضل الرحمان علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سینئر طالبِ علم تھے متاثر کن شخصیت کے مالک تھے مختار مسعود نے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو منفرد انداز سے اجاگر کیا ہے اس خاکے کا شمار اردو کے شاہکار خاکوں میں کیا جاسکتا ہے۔

ممتاز ماہرِ لسانیات پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ ''سفر نصیب'' کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کا نام ایک فارسی مصرع سے لیا گیا ہے ''خوش نصیب'' کی طرح کی

اس فارسی ترکیب کا مطلب ہے جس کے نصیب میں سفر کثرت سے ہو،
اس کے نصیب میں منزل بھی ہوتی ہے۔'' ۹

''سفر نصیب'' کے سفرناموں کے بارے میں سید وقار عظیم کا کہنا ہے:

''اس سفر میں مسافر کی چشم نگراں بڑی مستعدی سے مصروف کار ہے۔ جو کچھ سامنے آئے، اس کا نقش دل میں اترتا جاتا ہے۔ ہر منظر اپنے ساتھ ایک نئی کیفیت لاتا ہے اور یہ سب کیفیتیں دل میں بسیرا کر لیتی ہیں۔ دوسرا سفر حساس مسافر نے ذہن کے سہارے، تصور اور تخیل کے سہارے، اور قلب کی دی ہوئی روشنی کے سہارے طے کیا ہے۔ یہ سفر طویل ہے اور اس میں بے شمار موڑ، اور ان گنت اتار چڑھاؤ ہیں، اور منظروں کی بھرمار، عروج وزوال کے ولولہ انگیز اور عبرت خیز منظر، اور اعلیٰ اور ارفع قدروں کی توقیر اور تحقیر کے منظر، اور ان منظروں میں گھرے ہوئے وقت کے طوفانوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے انسان، کبھی طوفان پر غالب، اور کبھی اس سے مغلوب۔'' ۱۰

کتاب ''سفر نصیب'' پر سعود عثمانی کا مجموعی تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

''سفر نصیب'' ایک عجیب قسم کا سفرنامہ تھا۔ اس کا منفرد اسلوب تو خیر اپنی شناخت الگ رکھتا ہی تھا لیکن اس طرح کا سفرنامہ بھی اردو ادب میں کوئی اور نہیں تھا۔ غیر مربوط لیکن باہم جڑا ہوا۔ برف کدہ، پس انداز، طرفہ تماشہ اور زادِ سفر کے عنوانات صرف عنوانات نہیں بلکہ چار سو تھے۔ ان چاروں جہات کے سفر میں شخصیات، واقعات اور مشاہدات آپ کے ساتھ جہاز، ٹرین، کشتی اور ڈونگی میں سفر کرتے تھے۔'' ۱۱

۳...... ''لوحِ ایام''

مختار مسعود کی تیسری اہم تصنیف ہے جو حسبِ روایت ماہ جنوری میں شائع ہوئی۔ اس کا سالِ اشاعت ۱۹۹۶ء ہے۔ اب تک متعدد نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ مختار مسعود کی کتابوں کے انتساب منفرد انداز میں ہوتے ہیں ''لوحِ ایام'' کا انتساب ''چراغ اور دریچے'' کے نام موسوم کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں وہ چراغ جس سے اندھیرے چھٹ جائیں گے اُجالا ہی اُجالا ہو گا۔ بے سمت سفر کو سمت میسر آئے گی اور وہ دریچہ جو ایک روشن مستقبل کی جانب کھلتا ہے جس سے تازہ ہوا آئے گی اور جہانِ تازہ کی خبر لائے گی۔

کتاب تین ابواب شاہنامہ، آمدنامہ، اور منظرنامہ میں منقسم ہے۔ انجمن ترقی برائے علاقائی تعاون (آر سی ڈی) کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے ایران کے شہر تہران میں دورانِ تعیناتی ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء مختار مسعود کو جو واقعات پیش آئے اور جو مشاہدے انہوں نے کیے اس پس منظر میں ''لوحِ ایام'' انقلابِ ایران کے پس و پیشِ منظر کی ایک غیر جانبدار عکاسی کے ساتھ ہی تاریخ بھی ہے۔

یہ تصنیف مختار مسعود کے بالیدہ سیاسی شعور کی نمائندہ بھی ہے جس میں ایران کی تہذیب وتمدن اور سیاسی فکر کا انتہائی غیر جانبدارانہ تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب ''لوح ایام'' پر تبصرہ کرتے ہوئے امجد اسلام امجد کہتے ہیں کہ:

''لوحِ ایام میں انہوں نے جس طرح ایران کی قدیم تاریخ اور جدید تہذیب کی تصویر کشی کی ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ شاہِ ایران کے عروج کے دور اور امام خمینی کے تاریخ ساز انقلاب کے محرکات کو جس گہرائی اور خوبی کے ساتھ انہوں نے بیان کیا اس کا بیانیہ اور پس منظر دونوں ہی ان کے مطالعے، مشاہدے اور بصیرت کے ایسے مظہر ہیں جن کی کوئی مثال

معاصر تو کیا ماضی کی ادبی تاریخ میں بھی کم کم ہی مل سکے گی۔"[12]

خرم سہیل کا بھرپور تجزیہ تصنیف "لوحِ ایام" کے حوالے سے ملاحظہ کیجیے:

"لوحِ ایام" ایک کتاب نہیں تاریخ کی گواہی ہے جس میں یہ چشم دید گواہ ہیں۔ یہ ملک ایران ہے۔ جہاں ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کا خاتمہ ہوتا ہے اور اسلامی انقلاب برپا ہوتا ہے، جس کی خونچکاں "ایران بیتی" کو انہوں نے ایک پڑوسی ملک کے باشندے کے طور پر، ایک حساس انسان ہونے کے ناطے اور ایک تاریخ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے بھرپور طریقے سے لکھا ہے، بلکہ اس کو گہرائی سے لکھنے کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈالی۔ یہ کتاب ایران کے انقلاب پر ہمیشہ ایک بنیادی حوالہ رہے گی، کیونکہ اس کے ماخذ کہیں اور سے نہیں، بلکہ چشم دید گواہ کے مشاہدے اور تجربات سے نکلے ہیں۔"[13]

۴......"حرفِ شوق"۔

آخری تصنیف "حرفِ شوق" ہے جو ستمبر ۲۰۱۷ء میں مختار مسعود کے انتقال کے تقریباً پانچ ماہ بعد شائع ہوئی انتساب "طلبہ علی گڑھ کالج" کے نام کیا ہے "حرفِ شوق" کا اختتامیہ ان کی شریکِ حیات عذرا مسعود کا تحریر کردہ ہے۔

کتاب کُل چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "ماضی کے ساتھ ایک نشست" میں علی گڑھ کالج کے قیام کا پس منظر اور اسٹریچی ہال کی تعمیر کا حال بہت خوب صورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

اس باب کے بارے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر لکھتے ہیں:

"یہ مضمون انہوں نے "لیف" کے ایک اجلاس میں سنایا بھی تھا جو ماڈل

ٹاؤن لائبریری لاہور میں منعقد ہوا تھا۔'' [۱۴]

دوسرا باب ''سر سیّد احمد خان کون تھے؟''۔ اس میں انہوں نے سر سیّد سے عقیدت و محبت کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے سر سید کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ مدرسۃ العلوم کے قیام اور سر سید کے مخالفین کا ذکر بھی کیا ہے۔

حرف شوق کے دوسرے باب کے بارے میں نعیم الرحمٰن رقمطراز ہیں:

''سر سید احمد خاں کون تھے؟'' میں ایک عظیم مصلحِ قوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ جس میں سر سید کی تحریروں کو پڑھنے اور سمجھنے کی ترغیب موجود ہے۔ ایک ایسا نابغہ جسے نہ اس کی زندگی میں سمجھا گیا اور نہ مرنے کے بعد وہ مقام ملا، جس کا وہ حق دار تھا۔ مختار مسعود نے کسی حد تک سر سید کا قرض اتارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔'' [۱۵]

تیسرا باب ''باعثِ تحریر'' میں ماضی اور علی گڑھ سے جڑی یادوں، باتوں، اپنی تعلیم، ملازمت اور ادب پر منفرد انداز سے بات کی گئی ہے۔

جس کے بارے میں ظفر حسین ظفر کا کہنا ہے کہ:

''تیسرا مضمون ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک مورخ اور سوانح نگار کی طرح واقعات کی فہرست بھی ہے اور ان پر ایک دانشورانہ رائے بھی۔ اِس مضمون میں توقعات اور امکانات کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کے نقوش بھی ابھرتے ہیں۔ مصنف کی شخصیت وآثار پر کام کرنے والے محققین کے لیے اس باب میں تحقیق وجستجو کے کئی عنوانات موجود ہیں۔'' [۱۶]

اس باب کے حوالے کچھ اسی طرح نعیم الرحمٰن بھی رقم طراز ہیں:

''حرفِ شوق کا تیسرا مضمون ''باعث تحریر'' ہے۔ جسے کسی حد تک مختار مسعود

کی آپ بیتی بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون کے کئی چشم کشا حصے ہیں۔"[۱۷]

چوتھا اور آخری باب "مرحوم کے نام ایک خط" انہوں نے اپنے علی گڑھ کے دوست ڈاکٹر نسیم انصاری کو لکھا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے ان کی کتاب "آوازِ دوست" کے جواب میں کتاب "جوابِ دوست" لکھی تھی مختار مسعود کا خط ان کی اسی کتاب کے بارے میں ہے۔

ارشد محمود ناشاد "حرفِ شوق" کے اس باب کے حوالے سے کہتے ہیں:

"کتاب کا آخری مضمون "مرحوم کے نام ایک خط" ۵۴ صفحات کو محیط ہے۔ مرحوم نسیم انصاری تھے جو پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر اور مصنف کے بچپن کے دوست تھے، وہ ہندوستان میں ہی رہے اور پھر امریکہ چلے گئے انہوں نے "آوازِ دوست" کے جواب میں "جوابِ دوست" ۱۴ برس بعد لکھی۔"[۱۸]

"مختار مسعود نے اپنے دوست کی وفات کے دس سال بعد اس کا جواب لکھا۔ جس میں مرحوم کے ترقی پسندانہ نظریات پر نقد و چھیڑ چھاڑ، حیات بعد الموت اور دیگر شخصیات کے حوالے سے بھی گفتگو ہے۔"[۱۹]

مختار مسعود کی رائے "جوابِ دوست" کے حوالے سے ملاحظہ کیجیے:

"جوابِ دوست" نسبتاً ایک مختصر تحریر ہے مگر اس کی زمانی، مکانی اور نظریاتی حدود بہت وسیع ہیں۔ اس کی قلمرو میں علی گڑھ کے علاوہ لکھنو، کلکتہ، لندن اور بن غازی شامل ہیں۔ کتاب کا ایک حصہ آزادی کے بعد کے حالات کے لیے وقف ہے۔ دوسرا آپ کے سوانحی واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسرا اُن نظریاتی مسائل سے تعلق رکھتا ہے جن کی عمر اتنی طویل ہے جتنی اسلام میں اختلافات کی ہو سکتی ہے۔ "جوابِ دوست" میں وحدت الوجود،

تصوف، خالق کا تصور، تخلیق کی نوعیت اور جبر و قدر جیسے مسائل کے ساتھ
مسلمانوں کی تاریخ کے الجھے ہوئے واقعات اور موضوعات (بای ذنب،
علمی جمود، گستاخانہ اشعار، زین آبادی) ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ملیں
گے۔ انہی سے کتاب میں تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوتی ہے اور مصنف کے
شوق اور ذوق کی گونا گونی کا پتا ملتا ہے۔'' [۲۰]

مختار مسعود کی کتاب ''حرفِ شوق'' علی گڑھ کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے جسے پڑھ کر قاری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے بام و در میں خود کو موجود پاتا ہے۔

مدون نگارشات

مختار مسعود کو اردو، فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی کامل دسترس تھی چنانچہ دو انگریزی کُتب بھی ان کے ادبی سرمائے میں شامل ہیں۔

1. An Appraisal of Land Resources in West Pakistan :-

یہ اعداد و شمار اور جغرافیائی تناظر میں مغربی پاکستان کے ارضی وسائل پر لکھی جانے والی وہ رپورٹ ہے جو انہوں نے بڑی جانفشانی سے ایڈیشنل سیکرٹری منصوبہ بندی کمیشن حکومتِ پاکستان کی حیثیت سے تیار کی تھی جسے ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ پرنٹنگ پریس مغربی پاکستان نے سرکاری ضرورت کے تحت محدود تعداد میں شائع کیا تھا۔

2. Eye Witness of History :-

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے نام چوالیس اکابرین کے غیر مطبوعہ خطوط کو مختار مسعود نے (Eye Witness of History) کے نام سے مرتب کر کے اپنے ایک دقیق تعارف کے ساتھ جنوری ۱۹۶۸ء میں گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی سے شائع کروایا۔ ان خطوط کے بارے ان کا کہنا ہے:

''یہ تاریخ کے عینی شاہد ہیں۔'' [۲۱]

اقبال نامہ

علامہ اقبال کے خطوط کے مجموعے ''اقبال نامہ'' جو ان کے والد صاحب شیخ عطا اللہ نے دو جلدوں میں مرتب کیے تھے، مختار مسعود نے اس پر نظر ثانی مع اپنے کلیدی مضمون ''پس منظر'' کے نام کے ساتھ یک جلدی زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔

افسانہ نگاری

مختار مسعود نے افسانہ نگاری میں بھی قلم آزمائی کی ایک ترجمہ اور دو طبع زاد افسانے ان کے افسانوں کا کُل سرمایہ ہیں۔

ا...... ''سرخ فیتہ''۔

یہ افسانہ ایک چینی کہانی کا ترجمہ ہے جس کے مصنف لن یوتانگ [۲۲] ہیں اسے مختار مسعود نے اردو کے قالب میں ڈھالا، جو ۱۹۶۲ء میں رسالہ سہ ماہی الزبیر، بہاولپور کے ''غیر ملکی افسانے'' نمبر میں شائع ہوا تھا اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر کا کہنا ہے:

> ''اس افسانے کا اردو ترجمہ مختار مسعود نے کیا اور اس کا اردو نام ''سرخ فیتہ'' رکھا ہے۔ یہ نام مترجم کی زندگی اور اس کی سرکاری ملازمت کے حوالے سے بہت موزوں ہے۔ گویا اس نے کارکنانِ قضا و قدر میں بھی لوگوں کے کیسز کو سرخ فیتے کا شکار کرنے والے ڈھونڈ لیے ہیں۔'' [۲۳]

ڈاکٹر زاہد منیر عامر اس افسانے کے اسلوب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''ترجمے کی عبارت بہت رواں ہے اور افسانہ پڑھتے ہوئے سوائے ہیرو کے نام اور کچھ پس منظری تفصیلات کے اجنبیت کا احساس نہیں

ہوتا۔''۲۴؎

۲......''فاصلہ''۔

یہ مختار مسعود کا پہلا طبع زاد افسانہ ہے، جو جنوری ۱۹۶۳ء میں رسالہ نقوش، لاہور کے سالنامے میں شائع ہوا تھا۔اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر کہتے ہیں:

''جس افسانے میں مختار مسعود کے فن کا بہترین اظہار ہوا وہ ''فاصلہ'' ہے۔یہ افسانہ ان کی پیشہ ورانہ زندگی ،طبقہ اناث کے مطالعے ،سراپا نگاری، منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔انتظامی عہدوں پر فائز یا زندگی کے روکھے پھیکے معمولات میں محصور لوگوں کے لیے طبقہ اناث سے رابطے کی راہیں کس طرح کشادہ ہوتی ہیں۔''۲۵؎

۳......''قالین''۔

یہ آخری طبع زاد افسانہ ہے، جو نومبر ۱۹۶۸ء میں رسالہ ''نقوش'' کے افسانہ نمبر میں شائع ہوا تھا۔اس افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی رائے ملاحظہ کیجیے:

''افسانے میں کہانی پن بھی ہے اور تجسس بھی ،رمزیت جو اچھے ادب کی جان ہے افسانے میں بڑی خوبی سے موجود ہے۔ ہر چند کہ ایک پست معاشرے کے پست کرداروں کی پیش کش سے افسانہ خالی نہیں لیکن ان کی پیش کش میں برتی جانے والی شائستگی افسانے کو ابتذال سے محفوظ رکھتی ہے۔''۲۶؎

افسانہ نگاری کا یہ عمل مزید آگے بڑھتا مگر مختار مسعود کو ان کی ہم عصر ادب دوست مشہور ادیبہ جمیلہ ہاشمی نے مشورہ دیا کہ وہ افسانہ نگاری کی بجائے اپنی مکمل توجہ سنجیدہ نثر پر مرکوز رکھیں جس کے

بعد انہوں نے افسانہ نگاری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ [۲۷]

اسلامی طرزِ حیات کے معاشی ضابطہ (غیر مطبوعہ)

مختار مسعود نے بیس سال [۲۸] کی عمر میں ۴۸-۱۹۴۷ء [۲۹] میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ایم اے معاشیات امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ سال آخر میں انہوں نے اسلامی ممالک کی سیاسی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جدید اسلامی سیاسی اور معاشی نظام کے خدوخال کو واضح کرنے کے لیے مشقی مقالہ (Economic code of Islamic life) لکھا جو اپنے مواد اور تقابلی جائزہ کی بنا پر افادیت کا حامل تھا، افسوس کہ زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہوسکا۔

خطوط نگاری

مختار مسعود کے غیر مدون علمی ورثے میں وہ بکھرے خطوط بھی شامل ہیں جو انہوں نے مختلف علمی، ادبی انتظامی اور اپنے احباب کو لکھے۔ اب تک پروفیسر محمد اقبال جاوید وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے اس طرف توجہ دی انھوں نے اپنے اور مختار مسعود کے مابین خطوط کا ایک مجموعہ ''مختار مسعود مکاتیب کے آئینے میں'' جون ۲۰۱۷ء میں مرتب کیا ہے، جب کہ مختار مسعود کے چند خطوط بنام منشی عبدالرحمٰن خان اور ایک خط پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے نام، امر شاہد نے کتاب ''صاحبِ آواز دوست'' میں شامل کیے ہیں۔ اگر کوئی محقق اس جانب توجہ دے تو امید ہے کہ مختار مسعود کے خطوط کا جامع مجموعہ مرتب ہوسکتا ہے جس سے نہ صرف کئی علمی، ادبی، انتظامی، سیاسی و تاریخی واقعات سے پردہ اٹھے گا بلکہ ساتھ ہی اس صنف میں بھی مختار مسعود کے مقام کا تعین کیا جاسکے گا۔

مختار مسعود کے مختلف مضامین، تقاریر، ادبی مکالمے اور چند کتب پر لکھے دیباچے وہ بکھرا ہوا ادبی سرمایہ ہیں جن کو اگر مدون کر لیا جائے تو اس سے مختار مسعود کی ادبی شخصیت کے کچھ اور پہلو بھی ابھر کر سامنے آئیں گے۔ مختار مسعود سنجیدہ نثر نگار ہونے کے ساتھ ہی ایک فلسفی، مدبر اور

مصلح کار بھی ہیں، اسلام، پاکستان اور اس کا مستقبل ان کے فکر و خیال کا محور ہیں وہ طلبہ کو مستقبل کا معمار جانتے اور ان کو درست سمت اور بلند کردار کا محبِ وطن فرد دیکھنا چاہتے ہیں۔ جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر انھوں نے جو خطبہ اساتذہ اور طلبہ کے لیے پیش کیا اس کا لفظ لفظ خرد کی وادیوں سے مستقبل کی روشن راہوں کا تعین کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

خطبہ

''ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اپنی درس گاہ میں دو مرتبہ اسناد حاصل کرنے والوں کی صف میں شامل ہوا۔ ان دونوں تقریبات کے خصوصی مہمان تاریخ میں جگہ پا چکے ہیں۔ ایک پاکستان کا پہلا وزیر اعظم بنا اور دوسرے کو یہی درجہ بھارت میں حاصل ہوا۔ ان کے خطبات کو آج بھی پڑھیے تو ان میں برّاعظم کی تاریخ کے نشان ملیں گے اور بیس بائیس برس گزرنے کے باوجود ان کی تازگی میں فرق نہیں آیا۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا جسے میں نے صرف اس خیال سے پیش کیا کہ خطباتِ جلسہ تقسیم اسناد کا مقام واضح ہو جائے۔''[۳۰]

''موقع اور محل کی نسبت اور روایت کی رعایت سے میں ان طلبا کو بالخصوص مخاطب کرنا چاہتا ہوں، جو آج اسناد حاصل کر رہے ہیں اور کالج کی چار دیواری سے نکل کر مسابقت اور مقاومت کی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں۔ دورِ تعلیم کا اختتام اور زندگی کے نئے باب کا آغاز خوشی کی ایک منزل ہے اور ہم سب آج یہاں اس خوشی میں شریک ہونے آئے ہیں۔ مگر خوشی کے اس موقع پر جو شادیانہ بجایا جاتا ہے۔ وہ طاؤس و رباب نہیں بلکہ طبل جنگ کہلاتا ہے یوں تو زندگی کی بقا اور سلامتی کی جنگ پہلے سانس سے

شروع ہو جاتی ہے مگر عہدِ طفولیت کی معصومیت اور پھر درسگاہوں کی
پُرسکون فضا کافی دیر تک نوجوانوں کو اس جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھتی
ہے۔ درسگاہوں کی چار دیواری ایک ایسا حصار ہے کہ اس کی دوسری
طرف ہونے والی جنگ کے دھماکے کی آواز تک اس طرف سنائی نہیں دیتی
اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کے لیے دلجمعی سے علم حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا۔
لیکن جس طالب علم نے اس فریب سکون سے یہ مطلب اخذ کیا کہ اس کے
حصار کے دوسری جانب بھی زندگی کا دھارا اسی قدر نرم رو ہے اور وہاں بھی
اسی طرح جی سکتے ہیں، جیسے درس گاہوں میں، تو اس نے اپنے ذہن میں
دنیا کا صحیح نقشہ قائم نہیں کیا۔ مدرسے میں تو یہ ممکن ہے کہ بھری جماعت میں
استاد سر جھکائے حاضری لے رہا ہو اور آپ اگرچہ غیر حاضر ہوں مگر کوئی
شوخ ساتھی آپ کے نام پر بھی ''حاضر جناب'' کی آواز لگا دے اور آپ
حاضر تصور کر لیے جائیں لیکن جنگ کے میدان میں حاضری نہیں لگتی۔
صرف شجاعت دیکھی جاتی ہے۔ وہاں غیر حاضری ہزیمت اور شکست کا
دوسرا نام ہے۔''[۳۱]

مختار مسعود طلبہ کو ملک کے مستقبل میں بہت اہم کردار کا حامل سمجھتے تھے بلکہ ان کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ وہ طلبہ کو زندگی کے ان اصول وضوابط سے آشنا کریں جو انھیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں باوقار و کامیاب بنا سکیں۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

''عملی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو زندگی کے بارے میں اپنا
نظریہ متعین کرنا ہوگا اور بڑوں کے مشورے اس سلسلے میں آپ کی مدد
کر سکتے ہیں ممکن ہے کہ آپ میں ایسے لوگ بھی شامل ہوں جو یہ تصفیہ پہلے
ہی کر چکے ہوں مگر انہیں اپنے پرانے فیصلے کو اپنی نئی قوتِ فیصلہ اور نئی

استعداد کے ساتھ اسے دوبارہ پرکھنا ہوگا۔

ایملی ڈکنسن اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں کہ ”زندگی بسر کرنا اتنا حیران کن ہے کہ اس حیرت خانے میں کسی سوچ کے لیے مشکل ہی سے گنجائش نکلتی ہے۔ وہ قنوطی اردو شاعر تو آپ کو یاد ہوگا جو زندگی کو دیوانے کا خواب اور ایسا معمہ سمجھتا تھا جو سمجھنے اور سمجھانے کی قید سے آزاد ہے فاضل جمالی نے اس بارے میں اپنے بیٹے کو لکھا:

میری دانست میں زندگی امتحان کا دوسرا نام ہے اور خدا نے انسان کو اس لیے تخلیق کیا کہ اس دنیا میں اس کا امتحان ہو سکے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ہر روز اور ہر گھنٹے اپنے ہر عمل کے لیے ایک امتحان دینا پڑتا ہے۔

؎ ”اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی“

زندگی سانس کی بے مصرف تکرار کا نام نہیں۔ یہ دوروزہ زندگی صرف اسی شکل میں ہے کہ آپ موت کو زندگی سے زیادہ طاقتور سمجھیں یا زندگی کو حیات ارضی کے پیمانے سے ناپیں، حالانکہ

؎ ”ہے کبھی جان اور کبھی تسلیم جان ہے زندگی“

جن کے ہاتھ زندگی کی طویل مسافت میں ابتدا اور انتہا کا رشتہ نہیں آتا، وہ بابر کے ایک مشہور شعر اور خیام کی چند مشہور رباعیوں کو گنگناتے رہتے ہیں، گنگنانے کے لیے آنکھوں کے بند کرنے کا فعل سزاوار ہے اس لیے ان لوگوں کو حقائق سے چشم پوشی کی عادت ہو جاتی ہے۔

زندگی کی ماہیت اور اوراس کی اصلیت کو سمجھے بغیر زندہ رہنا ایک ذی ہوش انسان کے لیے ناممکن ہے۔ وہ گردوپیش پر نظر کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اتنا بڑا نظام، کائنات میں یونہی بلاوجہ محض ارتقا کے سفر میں واقع ہونے

والی ایک منزل کے طور پر تو وجود میں نہیں آیا۔ سعدی کہتے ہیں کہ مہ وخورشید وملک محض اس لیے تو کام میں مصروف نہیں کہ انسان اپنے لیے روٹی پیدا کرے اور غفلت میں زندگی بسر کردے۔ یہی خیال ہمیں پاکستان کی افواج کے ایک کمان دار کے خط میں ملتا ہے جو اس نے سیالکوٹ سے اپنے تمام ماتحتوں کو لکھا تھا۔ ان کا استدلال تھا کہ اگر کائنات کے نظام سے ضبط ونظم ایک لمحے کے لیے بھی نکال دیا جائے۔ یعنی یہ کہ سورج ایک دن کی رخصت اتفاقیہ پر چلا جائے۔ تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اب اگر اتنے وسیع اور پیچیدہ نظام کو کسی نے نقطۂ اعتدال پر رکھا ہوا ہے تو یہ بے مقصد اور بے مصرف تو نہیں ہوسکتا ہے۔ زندگی کے بارے میں قرآن مجید میں بہت سی ہدایات ہیں۔''۳۲

مختار مسعود نے اپنے خطبے میں طلبہ کو ''نصیحت کی اہمیت'' اور ''نصیحت کے آداب'' کے بارے میں بھی آگاہی فراہم کی۔ ملاحظہ کیجیے:

''ایسے اہم موقع پر آپ کے زادِ راہ میں چند نصیحتوں کا توشہ بھی شامل کر دوں تو مضائقہ نہ ہوگا۔ آپ کے لیے میں نے پہلے نصیحت کی تعریف وضع کی اور پھر بیشتر نصیحتیں ایک خاص صنف ادب سے مستعار لیں۔ نصیحت کی تعریف میری دانست میں یہ ہے کہ ہر حرف درست اور شیریں کو نصیحت کہتے ہیں۔ نصیحت میں جو اصول بیان کیا جائے۔ اس کا درست ہونا اور بیان کا شیریں ہونا میرے نزدیک نصیحت کے دو لازمی جز ہیں۔ جو بات نادرست ہے۔ وہ نصیحت نہیں فضیحت ہے اور جو حرف درست مگر درشت بھی ہے۔ وہ تنبیہ اور توبیخ کے زمرے میں تو شامل ہوسکتا ہے مگر نصیحت کا درجہ اسے حاصل نہیں ہوسکتا۔ نصیحت کی اس تعریف میں نصیحت کے کارگر

ہونے کی کوئی بھی شرط نہیں لگائی گئی۔ نصیحت کا با مقصد ہونا برحق مگر بامراد ہونا ضروری نہیں۔ نصیحت اور ''شرطیہ علاج'' میں یہی باریک سا فرق پایا جاتا ہے۔ جبر و اختیار کے اس پیچیدہ نظام میں کم از کم یہ بات بالکل واضح ہے کہ نصیحت کی کامیابی پر نصیحت کرنے والے کا کوئی اختیار نہیں۔ البتہ نصیحت کرنے والے کی ذاتی کامیابی اس کی محنت اور نیت پر مبنی ہے۔ یہ تو حکم خداوندی بھی ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں آیا ہے:

''خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔''

اس ہدایت کے ساتھ ساتھ نصیحت کے کہنے اور سننے کے آداب بھی مقرر ہیں۔ سننے کے لیے ذوقِ سماعت رکھنا اور کہنے کے لیے عالم باعمل ہونا لازم آتا ہے۔ ذوقِ سماعت کے سلسلے میں مثنوی مولانائے روم میں جو حکایت بیان کی گئی ہے۔ وہ جنگل میں ایک اجتماع سے متعلق ہے۔ جس میں خرگوش نے سماعت کے لیے شرط رکھی تھی کہ گوش خر بفروش و دیگر گوش خریوں تو ایک بہت بڑی شرط ہے مگر کہنے والوں کے لیے تو اس سے بھی کڑی شرط رکھی گئی ہے۔ کہتے کہ ''احسن القوم'' وہی اشخاص ہو سکتے ہیں جو اللہ کی جانب آنے کی دعوت دیں اور خود اس کے اعمال اس کے پیغام کے مطابق ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے اگر ایک عام اور معمولی عادت کے ترک کے لیے دُعا اور نصیحت کی فرمائش کی جائے تو جواب ملتا ہے کہ پھر آنا تاکہ درمیانی وقفے میں وہ خود اس عادت کے ترک کا تجربہ حاصل کرلیں''۔

نصیحت کے ان کٹھن آداب کے پیش نظر مجھے عافیت اس میں نظر آئی کہ میں دوسروں کے قول جو اوروں کے لیے بیان ہوئے تھے۔ آپ کے

سامنے رکھوں تاکہ مجھے بیان میں اور آپ کو سماعت میں آسانی رہے نہ کہنے والے پر ترک عادات لازم، نہ سننے والے کے لیے تبدیلی گوش کی ضرورت۔"[۳۴]

مختار مسعود نے خطبے میں طلبہ کو اخلاقیات کا درس دیتے ہوئے کہا:

"سیموئیل ٹیلر کالریج اپنے بچوں کو ایک طویل خط میں اخلاق کے دو اہم تقاضوں سے یوں متعارف کراتا ہے۔ خوش ہونا، نیک ہونے کے بغیر ممکن نہیں اور نیکی کی ابتدا اور ابجد یہ ہے کہ بچے والدین کے اطاعت گزار ہوں اور ان کے ساتھ محبت کریں۔ جب وہ موجود ہوں تو ان کی فرمابرداری کریں۔ باپ یا ماں کو خصوصاً ماں کو بھلا دینا یا جان بوجھ کر پریشان کرنا لازمی طور پر ایک انتہائی مذموم حرکت ہے۔ خدا کے نام کے بعد ماں کا نام سب سے پیارا اور سب سے زیادہ مقدس ہے اس کے بعد دوسری اچھی بات جس کے بغیر نہ تم کسی کی عزت کر سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا تمہارا احترام کر سکتا ہے، یہ ہے کہ ہمیشہ سچ بولو کیونکہ خدا نے تمھیں سچ بولنے کے لیے زبان دی ہے۔

کولریج کی پہلی نصیحت ہمیں ایک حدیث میں ملتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ نے فرمایا کہ:

"ایک شخص حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ مجھے کس کے ساتھ حسن معاملہ اور محبت کرنا بہتر ہے۔ فرمایا ماں کے ساتھ، اس نے کہا کہ پھر کس کے ساتھ، فرمایا کہ ماں کے ساتھ، اس نے کہا پھر کس کے ساتھ، فرمایا ماں کے ساتھ، اس نے کہا پھر کس کے ساتھ، فرمایا باپ کے ساتھ۔"

حکم خداوندی بھی اس سلسلہ میں صاف صاف اور دوٹوک ہے:

"اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیا۔" (۸۔۲۹)

کولرتج کی دوسری نصیحت بھی ہمیں حدیث میں مل جاتی ہے۔ حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے ارشاد فرمایا سچائی سے بھلائی حاصل ہوتی ہے اور بھلائی سے محبت، جو شخص سچ بولتا ہے وہ آخر کو صدیق ہو جائے گا اور جھوٹ بدکاری کی طرف انسان کو لے جاتا ہے اور بدکاری دوزخ کی طرف اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے آخر وہ خدا کے نزدیک کذاب ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں حکم ہے:

"اے ایمان والوں خدا سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔" (۱۱۹۔۹)۔"[۳۴]

منشی عبدالرحمٰن خان سے مختار مسعود کا اس وقت سے تعلق قائم ہوا کہ جب وہ ملتان میں تعینات ہوئے مختار مسعود کارِ سرکاری کی ادائیگی کے لیے ملتان اور بہاولپور میں تعینات رہے۔ منشی عبدالرحمٰن ایک متحرک علمی، ادبی، سماجی اور اعلیٰ منتظم تھے۔

مختار مسعود اور ان کے درمیان وقت گزرنے کے ساتھ رابط گہرا ہوتا گیا۔ منشی صاحب نے جب اپنی کتاب "کچہری کی دنیا" لکھی تو بطورِ خاص اس کا ابتدائیہ مختار مسعود نے تحریر کیا۔ مختار مسعود کے تپے تلے الفاظ اور اسلوب کو ملاحظہ کیجیے:

ابتدائیہ

"تقریباً بیس برس کے قلبی اور قلمی تعلقات کی بنا پر جناب منشی عبدالرحمٰن خان صاحب مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں نے کبھی رُک کر یہ سوچنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس کشش کے عوامل کیا ہیں؟ عبادت اور عمل یا فکر و نظریات

یا محنت اور دیانت، یا ان سب کا مجموعہ! میں نے تو کبھی ان کی جانی پہچانی اور معروف خوبیوں کی فہرست بنانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ وہ طویل ہونے کے باوجود نامکمل ہو گی۔ نہ میرا علم اتنا وسیع، نہ ان کی خوبیاں اتنی مختصر، یوں بھی حسن کردار تو ایک شعار کا نام ہے جو شمار سے بالاتر ہوتا ہے۔''۳۵

اس بات پر ان کے جاننے والوں کو اکثر تعجب ہوا کہ پیشہ کے اعتبار سے نصف صدی تک ایک دلدل میں پھنسے رہنے کے باوجود، ان کا پیراہن کیونکر صاف وشفاف ہے اور یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ ایسے مقام سے بامقصد زندگی کا پیغام لے کر آگے بڑھے جو بے مقصد فساد اور لایعنی جھگڑوں کے لیے بدنام ہے یہ ایک عام سوال ہے جو منشی صاحب کے بارے میں اکثر پوچھا جاتا ہے۔ میں نہ تعجب کرنے والوں میں شامل ہوں، نہ میں نے سوالیہ نگاہوں سے کبھی ان کے پیشہ کو دیکھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ایک دن منشی صاحب ملتان کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں تشریف لائے اور اسے نسخ خطاطی کا ایک مطلا، محشیٰ، مترجم، قطعہ تحفہ میں دے گئے۔ اس پر یہ آیت درج تھی:

''اور یہ لوگ دنیوی زندگی پر اتراتے ہیں اور دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بجز ایک متاع قلیل کے سوا اور کچھ بھی نہیں''۔

جو شخص اس آیت کا مطلب جان لے اس پر دنیا سہل ہو جاتی ہے۔

خواہ کچہری کی دنیا ہی کیوں نہ ہو۔''۳۶

مختار مسعود کے متعلق عمومی خیال یہ ہے کہ وہ شعری لطافت سے دور تھے۔ لیکن ایسا نہیں وہ نہ صرف شعر سے حظ اُٹھاتے تھے بلکہ شاعری کے اسرار و رموز کو اس کے پورے محاسن کے ساتھ سمجھتے بھی تھے۔ اس کی ایک خوب صورت مثال جسٹس ایس۔ اے رحمٰن کے شعری مجموعہ ''خیابانِ نوا'' (مرتبہ) مسز ایس۔ اے رحمٰن، کی تقریب رونمائی پر وہ مضمون ہے جو مختار مسعود نے پڑھا اس مضمون کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ لاہور کی علمی، ادبی، تاریخ، آرٹس کونسل سے لے کر

الحمرا تک کا سفر، منشی عبدالرحمٰن کی شخصیت اور ایس۔اے رحمٰن کی ان خدمات کو پہلی بار سراہایا گیا ہے۔

مضمون

''ماہ وسال کے اعتبار سے اگرچہ عرصہ بہت زیادہ نہیں ہوا مگر جس تیز رفتاری سے ہم اپنے عہد، فرائض اور تاریخ کو بھلا بیٹھے ہیں اس کے سبب یہ بات بہت پرانی لگتی ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ شہر لاہور کی ساری انجمن آرائی جسٹس ایس۔اے رحمٰن کے دم قدم سے تھی۔قیام پاکستان کے فوراً بعد لاہور کی علمی، ادبی اور ثقافتی روایت پر ایک کڑا وقت آن پڑا۔ پہلے آبادی کا تبادلہ پھر ترجیحات کی تبدیلی ایک طرف نت نئے مسائل اور دوسری طرف گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش۔ وہ جو ہزاروں خواہشیں ہوتی تھیں ان کی جگہ صرف ایک خواہشِ زر نے لے لی۔علم وادب ایک بے کار مشغلہ بن کر رہ گیا اور خدمت ایک بے کار جذبہ۔اس عالم میں یہ شہر ایک ایسے دانشور شخص کا منتظر تھا جو صاحب نظر ہو، اعلیٰ روایات کا امین ہو اور سرپرستی کا حق اور اس کی صلاحیت رکھتا ہو اور اسے وہ خلا بھی پُر کرنا تھا جو سر عبدالقادر کے انتقال سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شخص جس نے اس بار امانت کو اٹھایا اور جس نے اس خلا کو پُر کیا اس کا نام جسٹس ایس۔اے رحمٰن تھا۔'' ۳۷

''یہ جگہ جہاں آج الحمرا کے نام سے ایک عالی شان قصر ثقافت ایستادہ ہے یہاں ایک اجاڑ قطعہ زمین کے وسط میں واقع ایک بوسیدہ کوٹھی میں پاکستان آرٹ کونسل وجود میں آئی۔جسٹس ایس۔اے رحمٰن اس کے صدر

بنے اور پچیس برس تک اس اعزازی عہدہ پر فائز رہے۔ جسٹس رحمٰن اعزازی طور پر ہر اس کام کے لیے کمر بستہ رہے جس میں انھیں ملک اور قوم کا کوئی مفاد نظر آتا۔ وہ ۱۰ ربرس مرکزی اردو بورڈ کے صدر ۱۵ ربرس مجلس ترقی ادب اور بزمِ اقبال کے صدر اور سالہا سال تک مجلس زبان دفتری کے صدر رہے۔ مختلف علمی اداروں کی رکنیت اس کے علاوہ تھی۔ گاہے پنجاب یونیورسٹی کے رئیس جامعہ کا عہدہ بھی انہیں اضافی خدمت کے لیے سونپ دیا جاتا۔ یہ اس شخص کی قومی خدمات کا ذکر ہے جو بلحاظ عہدہ بڑی بلند سطح پر بے حد مصروف رہتا تھا۔ نہ وہ اس مزاج کے تھے کہ اعزازی عہدے جمع کرتے رہیں اور ان کے واجبات پورے نہ کریں اور نہ اس قماش سے تعلق رکھتے تھے جہاں ہر دل عزیزی کے شوق میں سرکاری فرائض کو اکثر بلکہ یکسر بھلا دیا جاتا ہے۔ منصبی کام کاج کی دردسری کے ساتھ معاشرتی خدمت کا دردِ دل مول لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کام میں ہاتھ ڈالنے کے لیے حوصلہ چاہیے اور اس کی کامیابی کے لیے قسمت۔ رحمٰن صاحب حوصلہ اور قسمت دونوں ساتھ لے کر آئے تھے۔'' ۳۸؎

''رحمٰن صاحب کے احباب میں ان کی ایک ہم نام شخصیت شامل تھی۔ فرق اتنا تھا کہ ایک شیخ تھا دوسرا خان ہے، ایک لاہور میں رہتا تھا دوسرا ملتان میں مقیم ہے، ایک چیف جسٹس تھا اور دوسرا درجات کی بلندیوں تک پہنچنے کے باوجود اب بھی اپنے نام کے ساتھ منشی لکھتا ہے۔ جسٹس رحمٰن کے خطبات کے مرتب اور ان کی اشاعت کے محرک محترم منشی عبدالرحمٰن خاں ہیں۔ ان کی توجہ اور کاوش کے بغیر آج سے کوئی پچیس برس قبل ''حدیث دل'' کی اشاعت قطعاً ممکن نہ تھی۔'' ۳۹؎

"خیابانِ نوا" کی خیاباں بندی کے لیے شاعر نے بہت سی اصناف سخن اور مختلف انداز کے علاوہ کئی زبانوں اور کئی حوالوں سے کام لیا ہے اردو کے اس مجموعہ میں فارسی اور پنجابی کلام بھی شامل ہے۔ ان کے بعض فارسی اشعار پڑھ کر یہ خیال آتا ہے کہ کاش وہ اس طرف کچھ اور توجہ دے سکتے۔ اس مجموعہ میں حمد، نعت، غزل، نظم، قطعہ بھی اصناف شامل ہیں۔ نظم روایتی بھی ہے اور آزاد بھی، غزل سیاسی بھی ہے اور مزاحیہ بھی۔"[۴۰]

"رحمٰن صاحب کی شاعری پر سب سے غالب اثر اقبال کا ہے۔ وہ خیال و شعر میں ان کا امام ہے۔ مقتدی جب اس امام پیچھے نمازِ عشق ادا کرتا ہے تو اس کے استعارے، اس کی تشبیہیں اس کے مصرعے اور اس کے تراجم سے کام لیتا ہے۔ رحمٰن صاحب نے اقبال سے ایک غزل کا عنوان بھی مستعار لیا ہے۔ عنوان ہے "سفر نصیب" یہ عنوان تو میں نے بھی اپنے سفر نامہ کے لیے اقبال سے لیا ہے مگر بلا اجازت۔ بڑے مفکر اور اچھے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس کی فکر اور کلام سے اس نیت کے ساتھ ادھار لیں کہ اسے واپس نہیں کرنا اور وہ خوشی سے اس امید پر دیتا رہے کہ ایک نہ ایک دن میری قوم اپنے عمل سے اس سارے قرض کو چکائے گی۔"[۴۱]

(ب) مختار مسعود شخص و عکس

کسی بھی ادیب اور اُس کے ادب پاروں کو سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کو جاننا انتہائی ضروری ہے شخصیت کا عکس ہی کسی ادیب کے اسلوب کا آئینہ ہوتا ہے شخصیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں اور تحریر ان پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے کسی بھی شخص میں اس کی خارجی اور داخلی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے خارجی پہلو میں شخصیت کی سراپا نگاری، سماجی زندگی، میل جول اور ظاہری خدوخال کو دیکھا

جاتا ہے۔ اس اعتبار سے تو مختار مسعود خوش لباس، خوش گفتار لب ولہجہ کے مالک ہیں ان کی جامہ زیبی ان کی شخصیت کی نفاست کو ظاہر کرتی ہے بلند قامت، خوبصورت قد کاٹھ اور متناسب جسم ان کی شخصیت کو جاذب نظر بنا دیتا ہے ان کی آنکھوں پر لگی ہوئی سفید عینک ان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔ ان کی اس پر وقار شخصیت کی وجہ مختار مسعود کی بیوروکریسی کی سرکاری ملازمت ہے۔ جس کی بنا پر ان کا حلقہ احباب مختصر ادیبوں سے دوری کا سبب رہا۔ ان کی تصانیف پر اظہارِ خیال کم کیا گیا یہی وجہ ہے کہ ہمیں مختار مسعود پر تبصرہ نگاری خال خال نظر آتی ہے۔

سرکاری منصب نے ان کی شخصیت میں بڑا نکھار اور خوب صورتی پیدا کی ان کا وہ فاصلہ جو سرکاری افسروں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے اور یہی فاصلہ ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے اور یہی ان کی تحریر کی دلکشی اور رعنائی ہے ان کی شخصیت کے سرکاری پہلو ہی کی وجہ سے مشرق ومغرب کے باریک مشاہدے میں ان کا یہ سرکاری عہدہ ہی مددگار ثابت ہوا جس نے ان کو دنیا کے مختلف خطوں اور قوموں کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا، جس کی مثال ان کی کتاب ''لوحِ ایام'' ہے، یہ ایران کے انقلاب کا آنکھوں دیکھا حال ہے جو انہیں سرکاری منصب ہی کی بدولت دیکھنے کا موقع ملا یہ کتاب اردو ادب میں بہترین نثر اور تاریخ کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھی جانے والی تصنیف ہے۔

مختار مسعود کی شخصیت کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ''مختار مسعود مزاج اور کردار کے لحاظ سے ایک پیارا انسان سہی اور اس کی تحریر اردو نثر کی بیشتر خوب صورت روایات کا دلآویز امتزاج سہی، مگر مشکل کا کیا علاج کہ وہ ایک سرکاری افسر ہے اور اس پر ستم کہ اعلیٰ سرکاری افسر ہے۔''[۴۴]

مختار مسعود کا حافظہ بہت اچھا تھا اور اسے وہ اپنی تحریروں میں بڑے اچھے انداز سے بروئے کار لائے ہیں اگر کوئی چیز ان کی نظروں سے گزر جائے تو سمجھیں وہ ان کے ذہن میں ہمیشہ کے

لیے نقش ہوگئی۔ان کے وسیع مطالعے، تجربے، مشاہدے اور ذہانت نے ان کی شخصیت میں تمکنت پیدا کر دی تھی، ان کی شخصیت میں ان کا اسلوب بیان، تقریر کا انداز، انٹرویو اور دوستوں کی مجلس ان کی علمیت اور ذہانت کی پہچان مانے جاتے ہیں۔

مختار مسعود کی شخصیت کے بارے میں محمد طفیل رقمطراز ہیں:

''مسعود سے ملنے گیا تو ان سے ملاقات ہوگئی، ان کی صورت اگر شرافت کا مجسمہ تھی تو گفتگو حلم کا نقطۂ عروج، پہلی ملاقات میں متاثر ہوا، دوسری میں مرید ہو گیا، عجیب موہنی تھی ان کی شخصیت میں۔''[۴۳]

مختار مسعود کی خارجی شخصیت پُر وقار ہے ان کی سراپا نگاری ان کی شخصیت سازی میں معاون ثابت ہوئی ہے۔علی گڑھ مسلم یونی کی فضا نے بھی مختار مسعود کی شخصیت سازی کی اور ان کے علمی گھرانے کا بھی اس میں اہم کردار ہے، ان کے مزاج کی سنجیدگی، کردار کی پختگی اور نظر کی وسعت میں ان کے عہد کا بھی کردار ہے زمانہ خود بڑا کردار ساز ہوتا ہے۔مختار مسعود کی شخصیت میں توازن ہے جو ان کی تحریروں میں بھی جھلکتا ہے جس گھرانے میں ان کی پرورش ہوئی وہ علمی اور مذہبی گھرانہ تھا جو اسلامی اصولوں کی پابندی کرتے تھے اس لیے ان کی شخصیت میں اسلام سے گہری محبت ان کی شخصیت کا حصہ ہے، وہ کم عمری سے ہی صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے وہ ہمیشہ محنت وعمل پر کارفرما ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خوشیوں سے بھرپور کامیاب زندگی گزاری۔

مختار مسعود منفرد شخصیت کے مالک ہیں وہ بڑے بڑے دانشوروں، سیاسی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں سے ملے اور انھیں قریب سے دیکھا ان تاریخی شخصیات کے اثرات سے مل کر مختار مسعود کی شخصیت نکھری شخصیت کو مختلف پیمانوں اور زاویوں سے دیکھا جائے تو مختار مسعود کی شخصیت کا داخلی پہلو ان کے افکار اور خیالات ہیں، کسی بھی ادیب کی باطنی خوبیاں اس کے ادب پارے میں نمایاں ہوتی ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ تحریر اور اسلوب شخصیت کے داخلی نکھار اور نفاست کا آئینہ ہوتا ہے۔

مختار مسعود تحریکِ آزادی کے فعال رکن تھے اور آزادی کے حصول تک انہوں نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ انہوں نے اپنی زندگی با مقصد گزاری ان کی شخصیت میں علی گڑھ نظر آتا ہے اس لیے انہیں فرزندِ علی گڑھ بھی کہا جاتا ہے۔

مختار مسعود بڑی عمدہ شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے نثر بھی بڑی عمدہ تخلیق کی ہے، جن شخصیات سے انہوں نے آٹوگراف لیے ان کی شخصیت کا اثر مختار مسعود پر گہرا ہے ان کی شخصیت بنیادی طور پر ایک مثبت سوچ اور حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہے ان کی شخصیت میں نرگسیت پائی جاتی ہے، ڈاکٹر سلیم اختر اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں مختار مسعود سے متعارف نہیں لیکن ان کی تحریر ان کی شخصیت کے نرگسی رجحانات کی غماز ہے۔''[۴۴]

مختار مسعود کی شخصیت جاذبِ نظر ہے جو قابلِ رشک ہے ان کی شخصیت میں خامیوں سے خوبیوں کا تناسب زیادہ پایا جاتا ہے۔

ان کی داخلی اور خارجی شخصیت کے تین اہم اور مضبوط پہلو ''اسلام''، ''علی گڑھ'' اور ''پاکستان'' ہیں ان کی تمام شخصیت کو انہی پہلوؤں کا مجموعہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

(ج) مختار مسعود کا اُسلوب

مختار مسعود کی نثر نگاری میں موضوعات کے علاوہ ان کے دلکش اسلوب کا بھی بڑا ہاتھ ہے جو انشاء پردازی کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے۔ مختار مسعود نے اسلوبِ سادہ نہیں لکھا بلکہ اسے مزین اسلوب کہا جاسکتا ہے اردو میں مزین اسلوب کے سلسلے میں ایک قدیم دبستان ہے اور مرزا رجب علی بیگ اس دبستان کے سب نمائندہ نثر نگار ہیں۔ قدیم دبستان کے ادیب لفظی بازیگری کے زیادہ ماہر تھے اور وہ لفظوں کے استعمال کے ذریعے جدت یا ندرت پیدا کر لیتے تھے۔

شاید اس کی وجہ علی گڑھ ہو۔ مختار مسعود کے اسلوب میں مختصر اور سادہ جملوں کی بجائے طویل اور

مرکب جملوں کا استعمال زیادہ ملتا ہے اور طوالت کے باوجود جملے کا زور آخر تک قائم رہتا ہے۔ مرکب جملوں میں کہیں کہیں بعد کے جملے پہلے جملے کی بڑی خوب صورتی سے شاعرانہ تشریح کرتے ہیں۔ مختار مسعود کسی خیال یا منظر کو چونکا دینے والے انداز میں ختم کرتے ہیں۔ اس قسم کے جملے ان کی تصانیف میں کثرت سے ملتے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ کیجیے:

"یہ طالب علم جو بائیس برس پہلے زخمی ہوا تھا اب شارع قائدِ اعظم پر واقع ایک فرم کا مالک ہے ملاقات ہو تو پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ تم نے وہ پٹی کیوں اتار دی ابھی تو بہت سے زخم ہرے ہیں۔" ؎۴۵

"خواجہ صاحب (ناظم الدین) نے اپنے لڑکے کو جو علی گڑھ میں پڑھتا تھا لکھا کہ تم کو چاہیے کہ تحریکِ پاکستان کے کام میں کوئی غفلت نہ ہو، تم تو اگلے سال بھی امتحان میں بیٹھ سکتے ہو مگر قوم کا ایسا امتحان ہر سال نہیں آیا کرتا۔" ؎۴۶

ان کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ طویل بات کو چند مختصر جملوں میں سمیٹ لینے کا فن جانتے ہیں اور جملوں میں لفظی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں خطیبانہ بلند آہنگی کی بجائے خطیبانہ بلاغت ہے۔ پڑھتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مختار مسعود خود اعلیٰ درجے کے مقرر ہیں۔ ان کی تحریروں میں تقریر کا حسن جا بجا جھلکتا ہے۔ تقریر میں عموماً جوش و خروش اور آواز کا عنصر نمایاں ہوتا ہے لیکن ان کی تحریریں میں جوشِ خطابت کی بجائے حسنِ بلاغت کا احساس ملتا ہے، بلاغت کیا ہے یا بلیغ انداز میں بات کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ باتیں نہایت واضح ہوں، باتوں کے بیان میں حسن ہو اور ان دونوں خوبیوں کا نتیجہ یہ ہو کہ سننے والے یا پڑھنے والے ان باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں یعنی ان باتوں میں تاثیر بھی ہو۔ اس بارے میں ڈاکٹر عبدالکریم رقمطراز ہیں:

"مختار مسعود کی تحریر عوامی نہیں۔ ان کا انداز سلجھا ہوا، اور سنجیدہ ہے۔ تاہم

ان کا خطاب عوام سے ہی ہے۔ وہ مختصر پیرائے میں ایسی بات کرتے ہیں
جس میں تکمیل اور تفصیل کی کمی کا احساس رہنے نہیں پاتا۔''۴۷

مختار مسعود کے یہاں اسلوب نثر کا ایک نیا انداز سامنے آیا ہے جس میں مصنف کی شخصیت کا عکس بھی جھلکتا ہے اور الفاظ کے برجستہ استعمال نے بھی ان کے اسلوبِ نثر کو جلا بخشی ہے۔ الفاظ کے استعمال اور انتخاب میں مختار مسعود نے بڑی مہارت اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔ اسلوب دراصل کسی شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔ مختار مسعود نے تخلیقی زبان کا استعمال کیا اور تخلیقی زبان کی بدولت ان کے اسلوبِ نثر کو انفرادیت ملتی ہے۔ تخلیقی زبان میں ایسے عناصر بھی ہوتے ہیں جو اسلوب کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ اس کے برعکس چند ایسے عناصر بھی ہوتے ہیں جن کا اسلوبیاتی عمل میں صفر کا مقام ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف میں سے کسی بھی کتاب کا مطالعہ کیا جائے ایسی طرزِ نثر سے واسطہ پڑتا ہے جس کا اندازِ تحریر سب سے جدا ہے۔ اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسلوب بیان میں مصنف کی ذاتی اور شخصی خصوصیت کا ہونا ضروری ہے مصنف طرزِ تحریر میں جو اسلوب اپناتا ہے، گفتگو، رکھ رکھاؤ میں جو اسلوب اختیار کرتا ہے، معاشرے میں اس کی شخصیت وہی نظر آتی ہے۔ مختار مسعود کی نثر کا جائزہ لیا جائے تو ان کے اسلوب اور شخصیت کا عرفان بغیر کسی تکلف کے تسلیم کرنا پڑتا ہے، تاریخ اردو ادب میں نثر پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو ابوالکلام آزاد اپنی پُر جلال اور بلند آہنگ شخصیت، شبلی اپنی انا پرست شخصیت، سرسید اپنی اصلاح پسند شخصیت، رجب علی بیگ سرور اپنی خوش مزاج شخصیت، اور عبدالرحمان بجنوری کی شخصیت، فلسفیانہ شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ان شخصیات کی شخصیت کا عکس ہمیں مختار مسعود کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے، اس انداز کے بارے میں محمد طفیل کا کہنا ہے:

''ان کی تحریر میں میر امّن کا علم مستعار بھی ہے، سرشار کی قصہ گوئی بھی ہے،
مولوی نذیر احمد کا مذہبی پچ بھی ہے، ابوالکلام آزاد کا شکوہ بھی ہے، محمد حسین
آزاد کی لفاظی بھی ہے۔''۴۸

مختار مسعود کا اسلوب متاثر کن اور سحر انگیز ہے۔ اس میں متاثر کرنے والی خصوصیات موجود ہیں۔ وہ تاریخی واقعات اور مشاہدات کو بڑی باریک بینی سے تحریر میں سموتے ہیں ''مینارِ پاکستان'' کا طویل مضمون ہو یا ''قحط الرجال'' کا کوئی تاریخی واقعہ، اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ حالات و واقعات کو ان کے سرکاری منصب کی بدولت اس مقام اور نظر سے دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملا جو کسی عام تاریخ داں یا لکھاری کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ ''قحط الرجال'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو ضلع کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی اس میں سر کردہ افراد بھی تھے اور سرکش اشخاص بھی تھے بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا یہ عطا اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔'' ۹۴

مختار مسعود کے اسلوب کو ان کی شخصیت کے پہلو میں نہ دیکھا جائے تو اسلوب کا تجربہ ادھورا رہے گا۔ اسلوب شخصیت کا نمائندہ ہے، اور مصنف کی شخصیت کا مقام متعین کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شخصیت اور اسلوب کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ دنیا کی یہی رِیت ہے مصنف کی وہی بات اثر کرتی ہے جس کے پیچھے عمل کارفرما ہوتا ہے۔ وہی اسلوب متاثر کن ہوتا ہے جو مصنف کے کردار و سیرت کا بھی عکاس ہو۔ بطور نثر نگار مختار مسعود کی طرزِ نگارش ان کی انفرادیت ہے، اردو نثر میں ان کی انفرادیت سے انکار نہ ممکن ہے ان کے اسلوب کی انفرادیت کی اصل وجہ ان کی تحریروں میں مختلف اصناف کا پایا جانا ہے، جیسے خاکہ نگاری، سفرنامہ نگاری اور سوانح نگاری کے فن کو کشید کیا گیا ہے۔

مختار مسعود کی وجہ شہرت ان کا مخصوص اسلوب ہے۔ اس اسلوب کی انفرادیت ان کے طرزِ نگارش کا وصف ہے۔ ان کے جملوں کی نشست و برخاست اور بناوٹ ڈھیلی ڈھالی نہیں بلکہ جملے چست اور چھوٹے ہیں غیر ضروری طوالت نہیں ہے۔ بات کہنے کا انداز ایسا ہے کہ قاری کی توجہ کو

فوراً اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ مختار مسعود کی اس انفرادیت پر جوش ملیح آبادی کا کہنا ہے:

''اردو کا تمام نثری سرمایہ میری نگاہ میں ہے، اور اس بنا پر بلا خوفِ ابطال یہ بات دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کہ الفاظ کی برمحل نشست، ابلاغ کی بے نظیر صلاحیت، اور طرزِ بیان کی بے مثال ندرت کا تعلق ہے، مختار مسعود صاحب ایک جدید طرزِ انشا کے موجد ہیں۔'' ۵۰؎

مختار مسعود کے اسلوب میں وہ کیفیت پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والا چاہے بھی تو مطالعے کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ اسلوب کی انفرادیت ان خصوصیات پر ہوتی ہے جن پر لکھنے والا آسانی سے پہچانا جا سکے۔ وہ لوگ جو منفرد اسلوب کی بنا پر خاص مقام رکھتے ہیں وہ اپنی تحریروں میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلوبِ نثر سے اپنی پہچان کروائی ہے۔ ان کی تصانیف اردو نثر کا شاہکار ہیں۔ مختار مسعود کی سنجیدہ نثر کے بارے میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ رقمطراز ہیں:

''مختار مسعود کے منفرد اسلوب میں ان کی زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے فارسی اور اردو ادب سے گہرا لگاؤ، نپی تلی نثر، جچتے ہوئے جملے، احتیاط سے تراشی ہوئی ترکیبیں، اور تاریخ و ادب کے حوالے، اُن کی تحریر کو ایک امتیازی شان عطا کرتے ہیں۔ وہی شان، جو صاحبِ طرز اور صاحبِ اسلوب نثر نگاروں کی پہچان ہوتی ہے۔'' ۵۱؎

مختار مسعود کے اسلوب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے ادیب اخلاقی اقدار کا کس حد تک پابند ہے اور اس نے دانشوروں کا اثر کس حد تک قبول کیا ہے۔ انہوں نے علی گڑھ کے علمی ماحول اور دانشوروں کے زیرِ سایہ اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی تحریروں میں اسلام سے پیار کا احساس بہت واضح دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہاں قرآن و حدیث کے حوالے تحریر میں ہیروں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''پاکستان کی مجلسِ آئین ساز کا اجلاس تھا، ملکِ معظم کا نمائندہ کہہ رہا تھا

آج میں آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں کل سے مملکتِ پاکستان آپ کے ہاتھوں میں ہو گی ، غیب سے آواز آئی ۔۔۔۔۔۔ " مالک الملک توتی الملک من تشاء " مالک الملک تو ہی دیتا ہے ملک جس کو چاہے۔" ۵۲

مختار مسعود کے اسلوب میں مشاہیر کے اقوال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے ان کی تحریر میں نکھار پیدا کیا ہے ان میں عالمی مشاہیر کے ساتھ اردو زبان کے ادیبوں کے بھی اقوال شامل ہیں، ملاحظہ کیجیے:

"نیوٹن نے کہا تھا کہ میں علم کے بحر ذخار کے کنارے سیپیاں چن رہا ہوں ۔" ۵۳

مختار مسعود نے جہاں اپنی نثر کو پُر لطف بنانے کی کاوش کی، وہاں ان کی تحریر میں بھی تراشیدہ، پر اثر اقوال موجود ہیں کیونکہ اسلوب میں شخصیت نظر آتی ہے جو منفرد اندازِ فکر اور سلیقے سے زندگی گزارنے کا ڈھنگ تحریر میں سموتی ہے، اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود، اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد، اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو، اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے، اور زندگی سے محبت ہو جائے، تو صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں۔" ۵۴

مختار مسعود لفظوں کی فنکارانہ ترتیب و تنظیم ، موضوع اور مواد کے درمیان تعلق سے اپنے اسلوب میں ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں کہ قاری اس کیفیت سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے، اور اس کا ادبی ذوق مزید نکھرتا ہے۔ ان کے اسلوب میں ان کی زبان کے سارے رنگ اپنے مکمل حسن کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے اسلوب میں شاعری کا تیکھا پن بھی موجود ہے۔ ان کے یہاں کوئی لفظ بے کار اور اضافی نہیں ہوتا، اور جہاں لفظوں کا استعمال کثرت سے ہے وہاں ان کا چناؤ اس

قدر مناسب ہے کہ اسلوب کو چار چاند لگ جاتے ہیں ان جیسے پار کھ تخلیق کار کا اسلوب عصری اُمنگوں کا ترجمان ہے بلکہ آنے والے وقت میں وہ دوسروں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

مختار مسعود ایک بڑے نثر نگار اور اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں۔ ان کی نثر میں فکر اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کے مزاج میں مشرقیت ہے۔ انہیں قدیم روایات، اور اقدار سے والہانہ لگاؤ ہے۔ وہ زندگی اور ادب میں پاکیزگی، اور نفاست کے قائل ہیں۔ ادب انسانی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے جس میں مشرقی روایات، اخلاقی اقدار زندگی کے تجربات، اور مشاہدات بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی فلسفی اپنے خیالات و تاثرات پیش کر رہا ہے۔ اسلوب میں انسان بہت جلد کھلتا ہے اس کے علاوہ دیگر طریقوں سے اس کی دریافت اتنی آسان نہیں۔ لہجہ کی ذرا سی درز سے اس کا سارا بھرم بڑی آسانی سے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن ہم تو جعلی ادیبوں کو فلسفی، سائنس داں اور عالم کہنے سے بھی باز نہیں آتے، پر مختار مسعود کا ہر فقرہ دلفریب، اور مکمل ادبی رنگ میں رچا بسا ہوتا ہے جو قاری کو اپنی بات آسانی سے سمجھاتا ہے۔ الفاظوں کا یہ چناؤ صرف ان کا ہی انداز تحریر ہو سکتا ہے۔

اپنے منفرد اسلوب کی بدولت اردو ادب میں مختار مسعود کی حیثیت صاحب طرز ادیب کی ہے جو کم ہی ادیبوں کو نصیب ہوئی ان کی کوئی بھی تصنیف لے لیں وہ قاری کو اپنے سحر میں رکھتی ہے ان کا ہر موضوع اپنی جگہ مکمل اسلوب کے ساتھ خوب صورت لفظوں سے آراستہ اور مزین ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ مختار مسعود کے اسلوب میں ادبی چاشنی و پرکاری، تہذیب کا رکھ رکھاؤ دلکش ہے، جس سے ان کے وسیع مطالعے اور مشاہدے کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے اسلوبِ تحریر میں عربی اور فارسی الفاظ ایک جوہری کے نگینوں کی طرح سے استعمال کیے گئے ہیں، اور قاری اس کی چمک دمک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ ان کے اسلوبِ بیان میں فکر کی گہرائی، جامعیت، اختصار اور سنجیدگی بھی ہے۔

مختار مسعود کی نثر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اسلوب کا معاملہ شخصیت کے آئینہ کی طرح کا ہے۔ کسی شخص کی تہذیبی تربیت، ذہانت، تخلیقی صلاحیت اسلوب کے آئینے میں نکھر کر جب سامنے آتی ہے تو ادب کی فضا محسوس ہوتی ہے جس سے زبان کے تخلیقی امکانات انفرادی جوہر، اسالیب کے مختلف رنگ اور اجتماعی احساس سے اس کا ربط، ادب اور زندگی کو اظہار کے پیرائے میں دریافت کرتا ہے اور یہ ادب کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ یقیناً یہ کام کوئی کند ذہن، بدمزاق اور غیر تخلیقی شخص ہرگز انجام نہیں دے سکتا ہے۔ طرزِ نگارش اپنے خالق کے اظہار پر چغلی کھاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کا مقصد ادب اور تخلیق کی بجائے کوئی دوسرا ہو، اور آپ کسی جھوٹی شخصیت کو اپنی مصلحتوں کی بنا پر ادب میں ہر صورت چلانا چاہتے ہوں۔ مختار مسعود کی نثر ادب میں نئے وارد ہونے والوں کو خاص پیغام دیتی ہے کہ نثر لکھنے کے لیے کم از کم اتنی ذہانت تو ضرور ہونی چاہیے کہ جملہ لکھتے ہوئے اسے کہاں ختم کرنا ہے، اور جملے کی بُنت کس طرح کی جاتی ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب لکھنے والے کو معلوم ہو کہ کونسا لفظ تحریر کے مفہوم کو پست یا طاقتور بنا رہا ہے۔

مختار مسعود سے افتخار عارف نے سوال کیا کہ اچھی نثر کی کیا پہچان ہے؟ جس کے جواب میں مختار مسعود نے اردو نثر پر اپنا موقف کچھ یوں بیان کیا، ملاحظہ کیجیے:

''* اچھی کتاب کی علامتی پہچان یہ ہے کہ اسے رکھنے کو جی نہ چاہے اور جب رکھیں تو گوشہ ورق کو موڑ دیں تاکہ جہاں چھوڑا وہاں سے دوبارہ شروع کر سکیں۔

* وہ لوگ جو مشق کو بیگار کہتے ہوں اور محنت کو بے دانش لوگوں کی ضرورت اور بار برداری کے جانوروں کی مجبوری سمجھتے ہوں ان سے کمالِ فن کی توقع رکھنا عبث ہے۔

* میرا مشورہ یہ ہوگا کہ آج کا کام آج ہی ختم کریں کل پر اسے ہرگز نہ ٹالیں۔ آج سے مراد زندگی اور کل سے مراد موت ہے۔

* اچھی نثر میں حذف و اضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔
* ہر وہ نثر جو آزردگی، دل تنگی اور ناخوشی کا موجب ہو وہ خراب ہے۔
* نثر میں آزار دینے والی خامیاں ہیں: مبہم اور گنجلک، جذباتی اور موضوعی، بے تحقیقی اور ہوائی، طوالت و تکرار، بناوٹ و تصنع، فکر کا فقدان اور الفاظ کی بہتات، جملہ اُکھڑا اُکھڑا اور باتیں اُکھڑی اُکھڑی۔
* اچھی نثر کی پہچان یہ ہے کہ اس میں حسن، زرخیزی اور خیر ہو: ''حسن'' عبارت کا، ''زرخیزی'' فکر کی اور ''خیر'' جو ان دونوں کا حاصل ہے۔'' ۵۵

مختار مسعود کے اسلوب پر علی گڑھ کے اثرات

مختار مسعود کی شخصیت میں علی گڑھ کی علمی فضا کے اثرات شامل ہیں۔ ان کی ساری تعلیم علی گڑھ کی ہے ساتھ اس تحریک کے اثرات ان کے اسلوب اور شخصیت میں شامل ہیں جو تحریک علی گڑھ میں پروان چڑھی یہ تحریکِ آزادی کی تحریک تھی، اور مسلمانوں کی زبوں حالی، مفلوک الحالی سے خوش حالی اور آزاد خیالی کے سفر کی جانب پہلے قدم کا درجہ رکھتی تھی۔ تحریک میں شامل علم برداروں نے مسلمانوں کو اپنے تشخص اور الگ وطن کا احساس دلایا۔ تحریک سے وابستہ قلم کاروں میں سے اکثریت کی تربیت اور ذہنی نشو نما علی گڑھ میں ہی ہوئی تھی۔

مختار مسعود کے اسلوب میں علی گڑھ کی فضا کے اثرات کی چھاپ نظر آتی ہے ان کی نثر میں علی گڑھ کا ذکر بار ہا ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے ذکر کے بغیر مختار مسعود کے اسلوب کی بات ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ مختار مسعود کے ہاں علی گڑھ آزادی کی علامت ہے یہ ایک ادارہ نہیں بلکہ ملک کا استعارہ بن کر آتا ہے۔ وہ علی گڑھ کو صرف درس گاہ کی حیثیت نہیں دیتے بلکہ مملکتِ خداداد اور تحریکِ آزادی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور خود اس تحریک کا حصہ ہیں، مضمون ''مینارِ پاکستان'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''علی گڑھ کو جو افزونی اور وسعت خدا نے عطا فرمائی اور جس طرح یہ مدرسہ آہستہ آہستہ ایک مرکز بن گیا اس کا ذکر ایک بار مجلسِ تعمیر میں ہو رہا تھا مجھے وقت کے کتنے ہی سنگِ میل یاد آئے جو تقریباً سو سال کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں مگر علی گڑھ کی نسبت سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھی اس کا رواں میں شامل ہوں جو کبھی وہاں سے گزرا تھا'' ۵۶؎

مادرِ علمی ''علی گڑھ'' کی یادیں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی تحریروں میں نمایاں ہیں وہاں کے دوست احباب، اساتذہ کرام اور تحریک کے ساتھیوں کا ذکر جا بجا پایا جانا، یہ ان کی تحریروں کا خاصہ ہے جس سے ان کی علی گڑھ سے والہانہ محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مختار مسعود کی علی گڑھ سے والہانہ محبت ان کی تمام تصانیف میں دیکھی جا سکتی ہے ان کی تحریر ہو یا گفتگو علی گڑھ کا عالمانہ اسلوب واضح طور پر نظر آتا ہے علی گڑھ ان کی مادرِ علمی بھی اور پرورش گاہ بھی ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان دلکش اور منفرد ہے جو ان کی پہلی تصنیف آوازِ دوست سے حرفِ شوق تک برقرار ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام کتب قاری کو اپنے سحر میں رکھتی ہیں وہ اپنی تحریروں میں الفاظ و محاورات کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ ان میں جدت و ندرت پیدا ہو، وہ الفاظ کے استعمال میں بڑی باریک بینی سے کام لیتے ہیں، ہر لفظ کو تاریخ کے خاص تناظر میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں، اس بارے میں نعیم الرحمٰن کہتے ہیں:

''بہت کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو صفحہ اوّل سے آخر تک خود کو پڑھوا لیتی ہیں مختار مسعود کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ قاری ان کی کتاب کی کوئی ایک سطر بھی چھوڑ نہیں سکتے بلکہ کئی پیراگراف لطف لینے، اور سوچ کے در وا کرنے کی خاطر بار بار پڑھتے ہیں ان کی کسی کتاب سے اقتباس دینا بھی ایک کڑا امتحان ہوتا ہے، کہ کس سطر کو منتخب کیا جائے اور کس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ فیصلہ ہرگز آسان نہیں۔'' ۵۷؎

مقفیٰ مسجع اسلوب کو مختار مسعود نے اپنے طرزِ نگارش میں بڑے زیرک انداز سے استعمال کیا ہے قافیہ پیمائی شاعری کا حسن مانی جاتی ہے، نثر میں اس کا استعمال اندازِ نگارش کو دلفریب بنا دیتی ہے اس کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے۔ انہوں نے اپنی تمام کتب میں اس حسنِ خوبی کو بڑی مہارت سے نبھایا ہے۔ مقفیٰ اسلوب خوبی ہی نہیں بلکہ خامی بھی شمار ہوتا ہے۔ اس خوبی و خامی سے بچنے کے لیے توازن لازمی ہے۔ مختار مسعود نے بھی قافیے کے گلستان سے جہاں اپنے اسلوب کے دامن کو معطر کیا ہے تو صرف چند پھولوں سے اپنے طرزِ نگارش کو مہکایا ہے، جس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

> ''پتھر نصب کرنے سے نسب اور نصیب نہیں بدلا کرتے۔'' ۵۸
>
> ''ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان گفتار میں فرد اور کردار میں مرد۔'' ۵۹
>
> ''بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے جاتے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔'' ۶۰

یہ جملے قافیہ پیمائی کا حسین امتزاج ہیں اور اقوالِ زریں کا درجہ رکھتے ہیں۔

مختار مسعود کے اسلوب پر سرسید کی شخصیت ان کی سوچ و فکر کا بھی گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کی طرح انہوں نے بھی مضمون نویسی سے لکھنے کا آغاز کیا ہے، سرسید کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''میرا سرسید ایک غیر معمولی آدمی ہے، وسیع النظر اور ہمہ صفت، موصوف، مصلح، دردمند، بیتاب اور انتھک انجمنوں اور اداروں کا بانی، اور منتظم، مصنف، اور مترجم، مفکر، اور مورخ۔'' ۶۱

مختار مسعود کو بات کہنے کا ہنر آتا ہے۔ ان کے اسلوب میں طوالت کے باوجود دلچسپی کا عنصر برقرار رہتا ہے۔ وہ سنجیدہ اردو نثر لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے گہرے مطالعے اور

وسیع تجربے کی بنا پر قاری کو حقیقتوں سے متعارف کراتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں تاریخی میناروں، تاریخ ساز انسانوں، برف کدو، غاروں، سمندروں، صحراؤں، ایرانی انقلاب اور علی گڑھ کے بارے میں بڑے رواں اور اپنی مخصوص طرزِ نگارش کے ساتھ بیانات کا تانتا جوڑا ہے جس سے وہ الفاظوں کے ماہر جوہری دکھائی دیتے ہیں، ان کا منتخب کیا ہوا، اور لگایا ہوا ہر نگینہ اپنی جگہ خوب صورت ہے۔ ان کی اس ادا پر امجد اسلام امجد رقمطراز ہیں:

''اپنی تحریر کی نوک پلک سنوارنے میں وہ جس قدر محنت اور ریاضت سے کام لیتے تھے اس میں سوائے محترم مشتاق احمد یوسفی کے ان کا کوئی ثانی کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔'' ۶۲

مختار مسعود کا قاری ان کی تحریروں کو پڑھنے کے لیے اپنی علمی سمجھ بوجھ کا معیار بلند سمجھتا ہے اور اس کی سوچ کے نئے زاویے کھل جاتے ہیں۔ وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے کر اسے اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں ان کے یہاں واقعات کی بُنت، لفظوں کی نشست و برخاست، عبارت کی روانی، قاری کو اپنا ہم نوا بنا لینے میں با کمال ہے۔ وہ اپنی تحریر میں اچھوتے اور دلکش استعاروں اور تشبیہات کا استعمال بڑے نفیس انداز میں کرتے ہیں۔ اپنی بات قلم سے قرطاس پر لکھتے وقت وہ بے محل اور غیر ضروری الفاظ کا استعمال کم ہی کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کی یہ خوبی شاید علی گڑھ کی وجہ سے ہو کیونکہ علی گڑھ سے تعلق رکھنے والے تمام قلم کار الفاظ کا بے جا استعمال غیر ضروری اور بے مقصد سمجھتے ہیں، مذہب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میں نے مشاہدہ کیا، پڑھا، پوچھا، غور کیا، بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو لوگ مذہب کو مصلحت کی انگشتری میں نگینہ کی طرح سجا لیتے ہیں وہ ہدایت اور عقیدہ سے دور ہو جاتے ہیں۔'' ۶۳

وہ بات سے بات نکالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ جس چیز کے بارے میں لکھنا شروع کر دیں تو الفاظ ہاتھ باندھے ان کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں اور تحریر خود بہ خود طویل ہوتی جاتی ہے۔ مختار

مسعود کی تحریروں میں اشعار کا استعمال بھی ملتا ہے۔ یہ اشعار اور مصرعے ان کی نثر کو دلفریب بنا دیتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشعار اُن کے اپنے تخلیق کردہ ہوں۔ مختار مسعود نے اپنی تحریروں میں صنعتِ تضاد کا استعمال بڑی خوبی سے برتا ہے، مثال ملاحظہ کیجیے:

''یہ وادی سوات ہے اُن دنوں گمنام اور بہت خوب صورت تھی، آج مشہور اور پامال ہے شہرت کتنی نقصان دہ ہوتی ہے کہ جس خوبی کی وجہ سے حاصل ہو اسی کے زوال کا باعث بن جاتی ہے۔'' ۶۴

مختار مسعود کی دسترس کا اندازہ ان کی تحریروں کے لفظوں سے نظر آتا ہے ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الفاظ، مرکبات، محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں، صنعت تجنیس یا چاہے کوئی بھی صنعت ہو ان کی گرفت سے باہر نہیں، اُن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو ایک جملے میں بیان کر کے آگے بڑھ جائیں، ضرب الامثال کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''عش عش کرنا، آوے کا آوا بگڑ گیا، حسرت برستی تھی، غنچۂ دل وا ہو گیا، ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیا، سارا نشہ ہرن ہو گیا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔'' ۶۵

مختار مسعود کے شاعرانہ اسلوب کی بڑی خصوصیت جملوں، فقروں میں ہم آواز الفاظ کی وجہ سے مرصع تحریر وجود میں آئی ہے وہ کبھی چھوٹے فقروں، جملوں اور واقعات کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے لفظوں کا تسلسل تحریر میں چار چاند لگاتا ہے۔ ان کی تحریر میں طنز بھی شامل ہے اور وہ اسے بڑے لطیف انداز سے پیش کرتے ہیں ان کی یہ خوبی ہے کہ وہ واقعات سے طنز پیدا کرتے ہیں یہ طنز معاشرے کی ناانصافیوں سے پیدا ہوتا ہے جسے وہ بڑے سلیقے سے نبھاتے ہیں۔

مختار مسعود کی تحریروں میں ایک انداز فلیش بیک تکنیک کا بھی ہے جس میں اچانک وہ الٹے پاؤں ماضی کی طرف چلنا شروع کر دیتے ہیں، اور گزرے ہوئے حالات و واقعات کو حال سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں وہ کامیاب رہتے ہیں۔ اس سے ایک منفرد انداز تحریر نمودار

ہوتا ہے۔ جیسے مینار پاکستان کی تعمیر کے وقت تحریک پاکستان اور علی گڑھ تحریک کو پلٹ کر دیکھنا، جہاز میں ہوائی سفر کے دوران وادی سوات سے گزرتے ہوئے شریکِ حیات کے ساتھ باہمی زندگی کا آغاز یاد آتا ہے، یا علی گڑھ کے طالب علموں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے ذہن میں اچانک بڑی عمر کے طالبِ علم فضل الرحمٰن سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تمام داستان پھر سے تازہ ہو جاتی ہے، اور مجلسِ تعمیر کی نشست میں ریختہ کے طور پر علی گڑھ کالج کے سنگِ بنیاد کا منظر یاد آتا ہے۔ انہوں نے اس تکنیک کو اپنی تصانیف میں بڑے بھرپور انداز میں شامل کیا ہے، جس میں وہ کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئے ہیں، اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''آج پھر مجلسِ تعمیر کی نشست تھی، میں نے پوچھا اس مینار کی بنیادیں کتنی گہری ہیں اور اس میں کون سا مسالا لگایا گیا ہے؟ جواب ملا کہ ماہرین کے تجزیے اور تحقیق کے مطابق بنیادیں بہت گہری کھودی گئی ہیں اور ان کی پائیداری کے لیے اعلیٰ درجے کا ریختہ استعمال کیا ہے میں نے دل میں سوال دہرایا یہ تو، پہیلی تھی جس میں بنیادوں کی گہرائی سے مراد محض یادوں کی گیرائی تھی، میں نے آنکھیں بند کیں، میرے سامنے سنگِ بنیاد نصب کرنے کا منظر تھا۔ ایک سپیشل ٹرین پٹیالہ سے چلی اور صبح ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔ وائسرائے گاڑی سے نیچے اترے تو مسٹر پولاک نے جو کمشنر تھے ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد دو انگریز آگے بڑے ایک ڈسٹرک جج تھا اور دوسرا کلکٹر، پاس ہی ایک ہندوستانی بھی کھڑا تھا، بھاری بھرکم اور طویل قامت، اس کی پیشانی ترکی ٹوپی میں اور چہرہ گھنی داڑی میں چھپا ہوا تھا، اس نے ہاتھ ملایا اور وائسرائے کو اپنے گھر لے گیا، دوپہر کو سنگِ بنیاد کی تنصیب کی تقریب تھی۔ ایک وسیع میدان میں پنڈال سجا ہوا تھا، معزز مہمانوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف کچھ فاصلے پر بہت سے ہاتھی

کھڑے تھے جن پر سوار ہو کر مہمان اس تقریب میں شریک ہونے آئے
تھے، میزبان کو مصروف دیکھ کر خیال آتا تھا کہ واقعی ہاتھی کے پاؤں میں
سب کا پاؤں ہوتا ہے تقریب تقریروں سے شروع ہوئی اور جب تقریریں
ہو چکیں تو مہمانِ خصوصی اٹھ کر شامیانے کے اس سرے پر گئے جہاں بنیاد
رکھنی تھی، پہلے کچھ کاغذات اور سکے دفن کیے گئے پھر ایک پتھر نصب
ہوا، اس پتھر پر تین ضرب لگا کر لارڈ لٹن نے کہا میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ
پتھر درست اور موزوں طرح سے نصب ہو گیا ہے یہ اعلان جنوری
۱۸۷۷ء کو علی گڑھ میں کیا گیا تھا یہ درست اور موزوں طور سے نصب
ہونے والا پتھر یوں تو کالج کا سنگِ بنیاد تھا مگر جس روز یہ نصب ہوا گویا اس
روز ''مینارِ پاکستان'' کی بنیادیں بھی بھری گئیں۔''[۲۶]

فلیش بیک کی تکنیک میں جو فکری مناظر ہیں وہ ان کے بچپن یا پڑھائی کے دوران کے وقت ذہن میں نقش ہوا یا اُن کے شوقِ سیاحت کے دوران، آنے والے واقعات کو وہ حال اور ماضی سے جوڑ کر قاری کو اپنی انگلی پکڑوا کر اپنے ساتھ چلاتے ہیں۔

مختار مسعود کی تصانیف میں منظر نگاری کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے ان کی تمام کتب میں منظر نگاری قاری کو مسحور رکھتی ہے، سفرنامے میں وہ مناظر قدرت کی تصویر کشی جس مہارت سے کرتے ہیں وہ صرف ان کے اسلوب کا ہی حصہ ہے۔ انہوں نے تمام مناظر کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چاہے وہ علی گڑھ کالج میں مہمانوں کی آمد کا منظر ہو یا کالج کے سنگِ بنیاد کا منظر، وہ ان کے اسلوب کا ہی خاصہ ہو سکتا ہے، منظر نگاری کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''کوہ البرز کی سب سے اُونچی چوٹی ساری گرمیوں ننگے سر دھوپ میں
کھڑی رہی اور جونہی اکتوبر میں گلابی جاڑا شروع ہوا اس نے ایک رات
خاموشی سے برف کی سفید ٹوپی اوڑھ لی برف کم کم تھی سستی ململ کی جھلمل

کرتی ٹوپی اتنی شفاف تھی کہ آر پار سب کچھ نظر آتا۔"٦٧

مختار مسعود کے اسلوب میں سوانحی رنگ بھی بدرجہ اُتم موجود ہے اس کا اظہار ان کی تصانیف میں جا بجا نظر آتا ہے آگے، سوانح نگاری کے باب میں ان کے سوانحی اسلوب پر تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

حواشی

۱۔ صاحبِ آوازِ دوست، (مرتب) امر شاہد، ص۲۰۲

۲۔ محولہ بالا، ص۲۰۳

۳۔ سید تاثیر مصطفیٰ، تحریک علی گڑھ اور اس کے کرداروں کی یادیں، مشمولہ: ہفت روزہ ''فرائیڈے اسپیشل'' کراچی، اگست ۲۰۱۷، ص۴۵

۴۔ آوازِ دوست میں شامل ہونے سے پہلے اگست ۱۹۶۹ء میں رسالہ نقوش، شمارہ نمبر ۱۱۲ میں شائع ہو چکا تھا

۵۔ جو مختار مسعود نے اپنے والد صاحب کے کہنے پر پانچویں جماعت سے بنائی تھی۔

۶۔ ادا جعفری، آوازِ دوست - میری رائے میں، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص۲۰۴

۷۔ جو ایک چینی مسلمان عالم تھے (ان کے والد صاحب نے انہیں اپنے گھر چائے پر مدعو کیا تھا)

۸۔ مختار مسعود، سفر نصیب، ص۷

۹۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، لوحِ ایام پر نقش آوازِ دوست کا سفر نصیب ہوا، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص۱۱۲

۱۰۔ سید وقار عظیم، آوازِ دوست - میری رائے میں: مشمولہ، صاحبِ آوازِ دوست، ص۲۰۲

۱۱۔ سعود عثمانی، کتابوں کا منتخب کردہ مصنف، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص۱۷۰

۱۲۔ امجد اسلام امجد، مختار مسعود، مشمولہ، صاحبِ آوازِ دوست، ص۱۱۵

۱۳۔ خرم سہیل، تاریخ کا چشم دید گواہ مختار مسعود، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص۱۴۲۔۱۴۳

۱۴۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر، مختار مسعود۔۔۔ جدائی کے تین سال، مشمولہ: روزنامہ 'نئی بات' لاہور، ۱۴/اپریل ۲۰۲۰ء

۱۵۔ نعیم الرحمٰن، حرفِ شوق، مشمولہ: ماہنامہ 'قومی زبان' انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، جولائی ۲۰۱۹ء، ص۵۲

۱۶۔ ظفر حسین ظفر، حرفِ شوق از مختار مسعود، مشمولہ: ششماہی 'ثبات' علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی،

اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۱۸ء، ص ۲۶۰

۱۷۔ نعیم الرحمٰن، حرفِ شوق، مشمولہ: ماہنامہ ''قومی زبان'' انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۵۳

۱۸۔ ارشد محمود ناشاد، حرفِ شوق از مختار مسعود، مشمولہ: ششماہی 'ثبات' علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۱۸ء، ص ۲۶۱

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۵۱۶

۲۱۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، لوحِ ایام پر نقش آوازِ دوست کا سفر نصیب ہوا، ص ۲۳۲

۲۲۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے چینی افسانہ نگار کا نام ''لف یوتا نگ'' لکھا جب کہ درست نام ''لن یوتانگ'' ہے مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے، مختار مسعود۔۔۔ 'سرخ فیتہ' مشمولہ: سہ ماہی 'الزبیر' (بہاولپور)، خصوصی شماروں کا ادبی و تحقیقی جائزہ۔۔۔ عفت سرفراز، ص ۱۳۳

۲۳۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر، مختار مسعود کی افسانہ نگاری، ویب گاہ ''آوازہ''

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ عذرا مسعود (بیگم مختار مسعود) نے یہ بات راقمہ کو موبائل فون پر بروز پیر ۶ر جنوری ۲۰۲۰ء سہ پہر ۴ بج کر ۵۳ منٹ پر دورانِ گفتگو بتائی۔

۲۸۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۱۹

۲۹۔ محولہ بالا، ص ۲۰

۳۰۔ مختار مسعود، مضمون، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص ۳۳۸۔۳۳۹

۳۱۔ محولہ بالا، ص ۳۳۹۔۳۴۰

۳۲۔ محولہ بالا، ص ۳۴۳۔۳۴۴

۳۳۔ محولہ بالا، ص ۳۴۰۔۳۴۱

۳۴۔ محولہ بالا، ۳۴۷۔۳۴۸

۳۵۔ مختار مسعود، مضمون، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص ۳۶۶

۳۶۔ محولہ بالا،ص ۳۶۶۔۳۶۷

۳۷۔ مختار مسعود، مضمون، مشمولہ: صاحب آواز دوست، ص ۳۶۸۔۳۶۹

۳۸۔ محولہ بالا،ص ۳۶۹

۳۹۔ محولہ بالا،ص ۳۶۹۔۳۷۰

۴۰۔ محولہ بالا،ص ۳۷۱

۴۱۔ محولہ بالا،ص ۳۷۲،۳۷۳

۴۲۔ مظفر حسین، مختار مسعود کی ادبی خدمات، ص ۱۹

۴۳۔ محمد طفیل، مختار مسعود، مشمولہ: صاحبِ آواز دوست (مرتب) امر شاہد، ص ۶۰

۴۴۔ مظفر حسین، ص ۲۴

۴۵۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۴۰

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ ڈاکٹر عبدالکریم، پرکاہ اور پارہ سنگ کے نام، مشمولہ: ماہنامہ پرواز، ص ۱۸

۴۸۔ محمد طفیل، محولہ بالا، ص ۶۴

۴۹۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۱۴۷

۵۰۔ جوشؔ ملیح آبادی، صاحبِ آوازِ دوست، ص ۴۰

۵۱۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، 'لوح ایام' پر نقش' آوازِ دوست' کا 'سفر نصیب' ہوا، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، ص ۱۱۳

۵۲۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۴۵

۵۳۔ محولہ بالا، ص ۷۹

۵۴۔ محولہ بالہ، ص ۲۴۔۲۵

۵۵۔ ظفر حسین ظفر، حرفِ شوق از مختار مسعود، ص ۲۶۱

۵۶۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۲۷

۵۷۔ نعیم الرحمٰن، حرف شوق، مشمولہ: ماہنامہ ''قومی زبان''، انجمن ترقی اردو پاکستان، جولائی ۲۰۱۹، ص ۴۸

۵۸۔ مختار مسعود، سفر نصیب، ص ۲۴۸

۵۹۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ۹۳
۶۰۔ محولہ بالا، ص ۷۵
۶۱۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۲۵۸
۶۲۔ امجد اسلام امجد، مختار مسعود، مشمولہ: صاحب آوازِ دوست، ص ۱۵
۶۳۔ مختار مسعود، لوح ایام، ص ۱۸۳
۶۴۔ مختار مسعود، سفر نصیب، ص ۲۳
۶۵۔ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی، مختار مسعود کا اسلوب، ص ۶۳۔۶۴
۶۶۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۲۵۔۲۶
۶۷۔ مختار مسعود، لوح ایام، ص ۱۸۶

☆☆

''مختار مسعود کے اسلوب میں بلا کی روانی ہے۔ حروف لفظوں میں، لفظ سطروں میں اور سطریں ایک دوسرے میں اس تیزی کے ساتھ مدغم ہوتی ہیں کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے اسے پر عطا ہو گئے ہوں۔ ہر آٹھ دس سطروں کے طوفانی بہاؤ کے بعد کوئی نہ کوئی مزیدار اور معنی خیز فقرہ ضرور آ جاتا ہے۔''

مختار مسعود کی سوانحی جہتیں

اردو سوانحی ادب پر سیر حاصل گفتگو باب دوم میں کی جا چکی ہے اس سے قبل کہ ہم مختار مسعود کی سوانح نگاری کے فنی محاسن کا مطالعہ و تجزیہ کریں ضروری ہے کہ سوانح نگاری کے چند نکات کا اعادہ کر لیا جائے۔

انسانی معاشرے میں تجربات کو خاص اہمیت حاصل ہے، یہ تجربات خود اپنے اور دوسروں کے لیے زندگی بسر کرنے کے معیارات فراہم کرتے ہیں۔ اسی لیے کسی فرد کی داستانِ حیات ہمیشہ سے قابلِ توجہ اور دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ رفتہ رفتہ سوانح نگاری نے ایک فن کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ آج دنیا کی ہر مہذب اور ترقی یافتہ قوم میں سوانح کو ادب کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اردو کے سوانحی ادب پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو اس کا تعلق مشرق اور مغرب دونوں سے ملتا ہے۔ پلوٹارک نے ''مشاہیر یونان و روما'' اپنے منفرد اسلوب میں قلم بند کر کے تاریخ ادب میں ایک نئے فن کی بنیاد رکھی جس کے اثرات مغرب نے بھی قبول کیے۔ پلوٹارک کو ''ٹی ایس ایلیٹ'' نے بڑے جامع الفاظ میں سوانح ادب کا سرخیل تسلیم کرتے ہوئے لکھا:

> ''شیکسپیئر نے پلوٹارک کی ''سوانحات'' سے جو کام لیا ہے وہ کام بہت سے لوگ پورے برٹش میوزیم سے نہیں لے سکتے۔''[1]

برصغیر پاک و ہند میں بھی یہ روایت قائم رہی۔ تذکرہ نویسی، تاریخ نویسی اور یادداشتوں کے ساتھ ساتھ ''تزک'' لکھنے کا رجحان موجود رہا، مغل بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے حالات و نجی کوائف انہی کے ذریعے ہم تک پہنچے، اور ہمیں مذکورہ عہد کے معاشرتی و تہذیبی تغیر کو جاننے کے مواقع ملے۔ اردو میں سوانح نگاری کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ اس کی تاریخ ایک صدی

سے کچھ زیادہ ہونے کے باوجود کیفیت کے لحاظ سے تو لائق ستائش نہیں البتہ کمیت کے اعتبار سے قابلِ تعریف ضرور ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر سے خطوطِ غالبؔ تک سوانحی ادب کا ایک مستقل عنصر یقیناً ملتا ہے لیکن اس معاملے میں سر سید احمد خان نے اپنے نانا کے بارے میں ''سیرتِ فریدیہ'' [۲] لکھ کر جدید سوانحی ادب کا چراغ روشن کیا۔ مغرب سے نفوذ کرنے والی اصناف، سوانح عمری (Biography) کو اردو ادب میں پروان چڑھانے کا سہرا بھی الطاف حسین حالیؔ کو حاصل ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ ''حیاتِ سعدی'' لکھ کر حالیؔ نے اردو زبان میں فنِ سوانح نگاری کا سنگِ بنیاد رکھا۔

دوسری اصناف کی طرح سوانح عمری بھی ادب کی ایک شاخ ہے، لہٰذا اس میں بھی ادبی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ سوانح نگار کو ایک طرف موضوع، مواد اور اسلوب کی طرف توجہ دینی ہوتی ہے تو دوسری طرف شخصیت کے نہاں خانوں کی نقاب کشائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ کامیاب سوانح عمری دراصل موضوع، مواد، اور اندازِ بیان کا حسین امتزاج ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سوانح نگاری کے پسِ پردہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سوانح نگار غیر جانبداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید شاہ علی نے بڑی جامع بات کی ہے:

''سوانح نگار منفرد آدمیوں کا ایک خوردبین کے تحت مشاہدہ کرتا ہے۔'' [۳]

ایسی سوانح عمری جس میں مصنف نے کسی کی زندگی کے کسی خاص حصے کی روداد، کسی اہم خدمت یا کارنامہ کا ذکر کیا ہوا سے ہم جزوی سوانح عمری (Partical Biography) کہہ سکتے ہیں اس کے بارے میں ڈاکٹر مظہر مہدی کی رائے کافی جامع ہے:

''یہ ایک بیانیہ اور نیم تخلیقی صنفِ ادب ہے، اس کی زبان تخلیقی اور ادبی ہوتی ہے، جذبات کے اظہار کا انداز ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، اس میں مصنف بھی کبھی حزینہ، کبھی خطیبانہ اور کبھی سنجیدہ انداز

اختیار کرتا ہے۔"۴۴

سوانح عمری کے حوالے سے محتاط ناقدین اس امر پر بھی توجہ دلاتے ہیں کہ اکثر معاملات میں مصنف اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اسی لیے سوانح عمریوں میں ایسی چیزوں کے افشا پر زیادہ قلم آزمائی کی جاتی ہے کہ اگر وہ افشا بھی رہیں تو سوانح عمری کے معیار اور اعتبار پر کوئی فرق نہیں پڑے۔ خودنوشت سوانح یا سوانح عمری میں سرشاریوں اور کامرانیوں کا تذکرہ ہو یا محرومیوں اور ناکامیوں کا، دونوں صورتیں در مدح خود کی ذیل میں آتی ہیں۔ موخرالذکر صورت میں اپنی جگرداری، تحملِ مصائب اور مظلومیت کی داد وصول کی جاتی ہے بلکہ اپنی حماقتوں اور بدحواسیوں کا تذکرہ بھی در مدح کی ذیل میں آتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے سوانحی ادب میں خاکہ کی اہمیت تسلیم کروائی تو مولوی عبدالحق نے وہ بنیاد فراہم کی جس نے "خاکے" کو سوانح کی صنف میں رائج و تسلیم کروایا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین، عبدالمجید سالک، اشرف صبوحی، چراغ حسن حسرت، شاہد احمد دہلوی، ضیاالدین برنی، شوکت تھانوی، ممتاز مفتی، علی زیدی، جوش ملیح آبادی، خواجہ احمد عباس، مالک رام، گلزار وفا چودھری، حمید اختر، ابوالفضل صدیقی، احمد بشیر، شجاع احمد زیبا وہ ممتاز اہلِ قلم ہیں جن کا قلم سوانحی ادب کی آبرو ہے۔

اس اجمالی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اردو سوانح نگاری آج ایک مکمل صنف کے طور پر اردو ادب میں اپنا مقام اور اعتبار قائم کر چکی ہے، سوانحِ نگاری کی نقد نے ایسے امکانات کی نشاندہی ضرور کی ہے جس سے سوانح کے بیانیے میں مبالغہ یا حقائق کے چھپائے جانے کے امکانات واضح ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود سوانح کی ہمہ جہت اہمیت وافادیت کو اردو ادب میں قبول کیا ہے، دورِ جدید میں باقاعدہ سوانحِ نگاروں کے ساتھ ایسے سوانحِ نگار جنھوں نے روایتی سوانحِ نگاری تو نہیں کی لیکن جابجا ان کی تخلیقات میں سوانحِ نگاری کے شہ پارے ملتے ہیں اور اگر ان سب کو مدون کیا جائے تو صاحبِ قلم کو سوانحِ نگار کے طور پر تسلیم کیے بغیر ادب کی غیر جانبداری

قائم نہیں رہ سکتی اس قبیلے کے سوانح نگاروں کے سرخیل مختار مسعود ہیں اس مقام پر مختار مسعود کی سوانح نگاری پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

(الف) مختار مسعود خودنوشت نگار

''خودنوشت'' کے مبہم نقوش اردو ادب میں تزک، تاریخوں، تذکروں، اولیا و مشائخ کے ملفوظات، روزنامچوں اور مکتوبات سے ملتے ہیں تاہم خودنوشت سوانح عمری یا آپ بیتی کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے یہ ایک مشکل اور صبر آزما فن ہے جس میں قلم کار کو کانٹوں پر چلنا پڑتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں سوانح عمری کے مقابل خودنوشت سوانح عمریاں کم رہی ہیں۔

''خودنوشت یا آپ بیتی'' جسے انگریزی میں Autobiography کہتے ہیں کے حوالے سے ناقدین کا مجموعی تاثر سامنے آیا ہے اس کے تناظر میں اگر خودنوشت کو دیکھا جائے تو بھی درست ہوگا۔

''خودنوشت'' اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں خودنوشت نگار اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سچائی اور ایمانداری کے ساتھ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ مصنف کی اپنی روداد یا کہانی ہوتی ہے جو عام کہانیوں سے ہٹ کر تخلیق کی جاتی ہے۔ خود نوشت کا تعلق دوسروں کی تحریروں سے نہیں ہوتا بلکہ یہ انکشافِ ذات ہے۔ اس میں مصنف اپنی زندگی کی داستان کو خود ہی قلم بند کرتا ہے اور اپنی زندگی میں آنے والے حقائق، تجربات، مشاہدات، نظریات کو پر خلوص انداز میں ربط کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ جس سے قاری مصنف کی ذات کے چھپے پہلوؤں سے واقف ہوتا ہے اور مصنف کی شخصیت بھرپور طریقے سے منفرد انداز میں اُجاگر ہوتی ہے۔ جس میں اس کا اسلوب بھی کارفرما ہوتا ہے، خودنوشت مصنف کا ہو بہو عکس ہوتا ہے اس میں مصنف کا عہد اور اس دور میں پیش آنے والے واقعات کا بیان اس خوبی سے کیا جاتا ہے کہ وہ تاریخ کا حصہ شمار ہوتا ہے اور اس دور کے حقائق کی نشاندہی سہل ہو جاتی

ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر خودنوشت نگار اپنی شخصیت کو اپنی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے پس منظر میں دکھاتا ہے۔ اپنی زندگی کے اُن گوشوں کو قاری پر عیاں کرتا ہے جنھیں صرف وہ خود ہی جانتا ہے۔ خودنوشت ادب کی مقبول صنف ہے اس میں مصنف اپنی ذات کے سحر میں کھویا رہتا ہے، اپنے خاندانی پس منظر، ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت، تخلیقی صلاحیتوں اور علمی کاوشوں کا بیان اپنے زمانے کے معاشرتی اور ادبی حالات کے پیش نظر کرتا ہے۔ جس سے قاری کو اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

''خودنوشت نگاری'' یقیناً ایک مشکل صنف ہے۔ جس میں مصنف خود اپنی ذات کا محاسبہ کرتا ہے، لیکن اس میں دلچسپی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جو قاری پر مصنف کی زندگی کے پرت کھولتا ہے اور قاری مصنف کی زندگی کے اہم گوشوں سے آشنا ہوتا ہے۔ خودنوشت نگار اپنے حالاتِ زندگی میں اپنے خاندان، بچپن، جوانی کے واقعات اپنی تعلیم و تربیت، درس گاہوں کا بیان، تعلیمی مدارج کا بیان، ادبی سرگرمیوں کا ذکر، رہن سہن، لباس، پسندیدہ پکوان کے ذکر کے ساتھ اپنی شخصیت کے کمزور اور طاقتور پہلوؤں کا بیان بھی سچائی اور حقیقت کی روشنی میں کرتا ہے۔ اپنے عہد میں رونما ہونے والے واقعات کا بیان بھی بخوبی کرتا ہے، جس سے تحریر میں تاریخ کا مزہ ملتا ہے۔

''خودنوشت'' ادب کی وہ صنف ہے۔ جس میں مصنف کی زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا وہ بیان ہے جو اس کی یادداشتوں میں محفوظ ہے اور انہیں وہ خود احاطۂ تحریر میں لاتا ہے۔ خودنوشت حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔ مصنف اس میں اپنی سمندر جیسی زندگی کو کتابی کوزے میں بند کرتا ہے، لیکن کچھ خودنوشت نگار اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ خودنوشت میں قاری کے لیے داستان، ناول، افسانے اور سفرنامے والی خوبیاں اور دلچسپیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ صرف واحد مصنف کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس کے مشاہدات، خیالات اور تاثرات کے ساتھ اس کے دور کی تہذیبی، ثقافتی، سماجی، سیاسی اور ادب کی بھی تاریخی جھلکیاں چمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لیے اس کو جگ بیتی بھی شمار کیا

جاسکتا ہے اس کو مصنف اپنے اسلوب نگارش سے آنے والی نسلوں میں منتقل کرتا ہے۔ خود نوشت کسی بھی مصنف کی مکمل زندگی کا احاطہ نہیں کر پاتی یہ صرف تادم تحریر ہوتی ہے۔

کچھ مصنفین نے اپنی آپ بیتیوں میں مبالغہ آرائی سے کام لیا اور حقیقتوں کو بے نقاب کرنے سے گریز کیا جس کے سبب اُن کی زندگی سے متعلق بہت سی باتیں تشنہ رہیں اور اُن کی تحریں ادب میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکیں۔

مختار مسعود نے شعوری نہ سہی لیکن لاشعور طور پر خودنوشت سوانح لکھنے کی جا بجا کوشش کی ہے۔ اور اس کی جھلک ''آوازِ دوست''، ''سفر نصیب''، ''لوحِ ایام'' اور ''حرفِ شوق'' میں بہت واضح نظر آتی ہے اپنے اسکول کی زندگی کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے بہادر یار جنگ کی پہلی تقریر اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے سیرتؐ کے جلسے میں سنی۔'' ۵

قد آور شخصیات کے بارے میں اپنے خیال کو یوں بیان کرتے ہیں:

''بڑے آدمی وہ ہی اچھے ہوتے ہیں جو اپنے کام میں مصروف ہوں تو سو پردوں میں پوشیدہ رہیں، اور جب فارغ ہوں تو سارے حجابات دور ہو جائیں اور یاران نکتہ داں کے لیے صلائے عام بن جائیں۔'' ۶

مختار مسعود اپنی شخصیت کے گرد ایک ہالہ رکھتے تھے ہر آنکھ اس میں دیکھنے سے قاصر تھی وہ جتنا جلوہ اپنی ذات کا منکشف کرنا چاہتے کرتے، علی گڑھ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مسلم یونی ورسٹی اور دار العلوم میں بھی ٹھن گئی۔ دین اور سیاست میں دونوں کی رائیں جدا ہوگئیں۔ حالانکہ ان دونوں درسگاہوں کے بانی یعنی سر سید احمد خاں اور مولانا قاسم نانوتوی ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ دونوں نے دہلی میں جس استاد سے پڑھا ہے ان کا نام مملوک علی تھا۔ ویسے مملوک العلی بھی درست ہے۔ قاسم نانوتوی تو ہندوستان سے ہجرت کر

چکے تھے مگر مکہ معظمہ سے واپس بلائے گئے۔ شروع میں علی گڑھ اور دیو بند کے مدارس میں طلبا کے باہمی تبادلے کا رواج بھی تھا۔ میں ایک شخص انیس احمد نامی کو جانتا ہوں جنھیں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے دور میں علی گڑھ سے گریجویٹ ہونے کے بعد اس اسکیم کے تحت دیو بند بھیجا گیا جہاں انہوں نے درسِ نظامی مکمل کیا۔ اگر یہ روایت جاری رہتی اور دونوں ادارے ایک دوسرے کے نزدیک آجاتے تو خوب ہوتا۔ اس قسم کے اشتراک کے لیے جس طرح کی عالی ظرف اور متوازن طبیعت چاہیے وہ عام نہیں۔'' ۷

اپنے ہر دل عزیز استاد کے بارے میں اپنی یادداشت یوں لکھتے ہیں:

''۴۷۔۱۹۴۶ء کا تعلیمی سال پروفیسر ایل کے حیدر کی مشغولی عمر کا آخری سال اور ایم۔اے معاشیات میں میرا پہلا سال تھا۔ وہ کلاس میں اپنے نوٹس کی کاپی لاتے اور بیشتر وقت اس میں سے پڑھتے رہتے، آہستہ مگر پختہ لہجہ میں گاہے سر اٹھاتے اور ذرا سی دیر تشریح کرنے کے بعد سر جھکا لیتے۔ رعب اتنا کہ نچلا نہ بیٹھنے والے شوخ لڑکے بھی ان کے پیریڈ میں پہلو بدلنے سے احتراز کرتے۔'' ۸

''لوحِ ایام'' انقلابِ ایران کا منظر نامہ ہی نہیں بلکہ موضوع کے اعتبار سے مختار مسعود کی خود نوشت ہے اس میں یادنگاری بدرجہ اُتم موجود ہے، اور یادوں کے تانے بانے ماضی کی باتوں سے ملتے چلے جاتے ہیں ذہن میں کلبلاتی یادوں کو بھلا کس نے گرفت میں لیا ہے، اور پابند کیا ہے؟ جہاں تہاں یلغار کرتیں، اور اردو خودنوشت کو دلچسپ سے دلچسپ تر بناتی چلی جاتی ہیں ایک رنگ ملاحظہ کیجیے:

''میری میز پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ہیروڈوٹس، تھوسیڈآئی ڈس، طبری،

سائیکس، ول ڈیورٹ آربری، براؤن۔ ایک دوست نے یہ ڈھیر دیکھا اور طنزاً کہا، آپ تہران جانے کے لیے تیاری کر رہے ہیں یا کسی امتحان میں بیٹھنے کے لیے۔ آرسی ڈی کے حوالہ سے یہ ساری کتابیں بے کار ہیں۔ آپ کے لیے پچھلے تین برس کی آرسی ڈی کی سالانہ رپوٹ کا مطالعہ ان سب کتابوں پر بھاری ہوگا۔ ایک بات اور یاد رہے۔ مستشرقین کو پڑھنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا بلکہ بہت کچھ کھونے کا امکان اور خطرہ ہے۔ آپ ایڈورڈ براؤن کے بہت قائل ہیں مگر علامہ اقبال اس سے بہت ناخوش تھے وہ ادبیات ایران کے بارے میں اس کی تحقیق کو وحدت وملت کے خلاف سازش کی ایک کڑی قرار دیتے تھے۔'' ۹

''لوحِ ایام'' میں ایران کے محلات کا ذکر انہیں پاکستان کے صادق گڑھ پیلس میں لے جاتا ہے، اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''مجھے ایک سنگِ مرمر کے مہمان خانے میں ٹھہرنا پڑا۔ یہ ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جس میں دالان کے چاروں کونوں پر چار آرپار تمان بنے ہوئے تھے۔ نواب بہاولپور کا مہمان خانہ تھا۔ راجوں مہاراجوں کے ٹھہرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ہر شے پرانی، قیمتی اور ضرورت سے ذرا زیادہ آرام دہ تھی۔ کروٹ لو تو سنہری پلنگ جھولے کی طرح جھولتا تھا۔ گدا اتنا نرم کہ سونے والا اس میں دھنس جائے۔ دُلائی اور تکیے میں مُرغابی کے پر بھرے ہوئے تھے۔ پردے مخملیں یا بناری۔ قالین کلاں اور دبیز۔'' ۱۰

اپنے ایران آمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب میں ایران آیا تو یہاں تین جھنڈے ہوا کرتے تھے۔ قومی، سرکاری، اور شاہی۔ دولت ایران کے سرکاری جھنڈے میں سبز، سفید اور

سرخ رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ درمیانی، سفید پٹی میں ایک شیر دائیں پنجے میں تلوار لیے ہوئے کھڑا تھا اور اس کی پشت پر سورج چمک رہا تھا۔ شیر و خورشید کے اس پرچم میں ببر شیر کی صورت اور سورج کی جگہ، مختلف بادشاہتوں میں بدلتی رہی۔ آخری تبدیلی محمد شاہ قاچار کے زمانے میں ہوئی جب اس نے ایک تھکے اور بیٹھے ہوئے شیر کی جگہ ایک چست و چالاک شیر کو کھڑا کر دیا۔ دُم کو دو بل دے کر ایسی اکڑ نت دی کہ ببر شیر تیغ بدست ہونے کے باوجود پشت کی جانب سے زیادہ جنگجو اور تیار نظر آتا ہے۔ انقلاب کے بعد شیر کا پتہ چلا نہ خورشید کا۔ دونوں یکا یک غائب ہو گئے۔ پرچم پر خالی رنگ دار لکیریں رہ گئیں۔''[۱۱]

''حرفِ شوق'' کو اکثر ناقدین ان کی خودنوشت یا آپ بیتی قرار دیتے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ جزوی خودنوشت اور سوانح نگاری کا مرقع ہے۔ اس میں جہاں مختار مسعود نے اپنے ابتدائی ایام کا ذکر، سرسید احمد خاں کی فکری تحریک، اور تعلیمی جدوجہد کا جائزہ، اور علی گڑھ سے وابستہ اَن مِٹ نقوش کو قلم بند کیا ہے، وہیں انہوں نے اپنی پسندیدہ یا یوں کہیے، کہ جن کی کسی نہ کسی عادت یا کمال نے انہیں متاثر یا متوجہ کیا، اس پر انہوں نے بلا جھجک اور دوٹوک قلم اُٹھایا ہے، اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے گروہ میں یہی کوئی بیس پچیس لڑکے تھے۔ وہ صبح سویرے تیار ہو کر اسکول کی راہ لیتے۔ چھوٹے بچے ظہور وارڈ کا رخ کرتے اور بڑے لڑکے منٹو سرکل (Minto Circle) کی پُرشکوہ قلعہ نما عمارت کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ہائی اسکول کی عمارت طلبہ کے لیے ان کی کُل کائنات تھی۔ جب ہم اس کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے تو اپنے آپ کو بڑا پرسکون اور محفوظ محسوس کرتے۔ دنیا صدر دروازے کے باہر ٹھہر جاتی، اسے اندر

آنے کی اجازت نہیں تھی۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے ثانوی مدرسے کی کنگورہ دار فصیل ہمیں اپنی پناہ میں لے لیتی۔'' ۱۲؎

مختار مسعود نے سر سید کی فکر میں جو سمجھا وہ یوں ہے کہ:

''سر سید یہ چاہتے تھے کہ اقتدار کھونے، نئی دنیا سے مقابلے کی صلاحیت نہ رکھنے، اور توہمات کو مذہب کا درجہ دے کر اس کی ریت میں سر چھپانے والے مسلمانوں کو جدید تعلیم اور علم نافع سے ایسے آراستہ کریں کہ انہیں اپنے نفع نقصان کا حساب لگانا آجائے اور وہ سر اٹھا کر حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکیں۔'' ۱۳؎

''لوحِ ایّام'' ایک ایسی خودنوشت ہے، جو موضوع و اسلوب دونوں اعتبار سے اعلیٰ مقام و مرتبے کی حامل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کئی بار پڑھنے کے بعد بھی اس خودنوشت کا سحر کم نہیں ہوتا، سحر انگیزی کی ایک وجہ تحریر کی دلکشی ہے۔ تحریر کی شگفتگی اور دل کشی کا سبب زبان کی سادگی، بیان کا اختصار اور رمزیت کا حسن ہے، نازک مقامات سے گزرتے ہوئے انہوں نے رمز و اشارہ اور تلمیح کا سہارا لیا ہے۔ کیوں کہ ان کی قوتِ مشاہدہ و استنباط بہت موثر ہے، اس لیے وہ متوازن انداز میں بڑی سے بڑی اور گہری سے گہری بات کو ادیبانہ انداز میں پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

مختار مسعود کی تحریر اتنی شگفتہ اور مربوط ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو پڑھوا لینے کی زبردست قوت رکھتی ہے۔ ''آوازِ دوست'' سے لے کر ''حرفِ شوق'' تک انہوں نے علم و دانش کے بہت سے معرکے سر کیے ہیں، لیکن ''آوازِ دوست'' میں ان کا اسلوبِ تحریر اپنے عروج پر نظر آتا ہے، اور جملے کے جملے ایسے ہیں جو اقوال زرّیں کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''آوازِ دوست'' سے ایک ایسا اسلوب اُبھرا ہے، جو مختار مسعود کی شناخت بن گیا ہے، وہ لہجے کے دھیمے پن، لفظوں کی کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے ہنر، مشاہدات و تجربات کو ناپ تول کر بیان کرنے کی خصوصیت، اور صاف ذہن کے ساتھ اپنی بات پورے طریقے، سلیقے، اور شعور سے قاری تک

پہنچاتے ہیں۔

مختار مسعود کی تحریروں میں شگفتگی کا ہلکا سا تاثر موجود ہے اس سلسلے میں ''آوازِ دوست'' کو اُن کی دیگر تصانیف پر برتری حاصل ہے۔ وہ اکثر واقعات اس طرح سپردِ قلم کرتے ہیں کہ طبیعت میں سرور پیدا ہوتا ہے، ان کے یہاں سماج کی کمزوریوں پر طنز کے نشتر کچو کے لگاتے نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ''لوحِ ایام'' خودنوشت ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی معاشرتی، معاشی، تہذیبی، سیاسی، ثقافتی وتہذیبی تاریخ بھی ہے اس میں سفرنامہ نگاری کے امکانات بھی موجود ہیں، اور یہ مختار مسعود کے ذہنی وروحانی سفر کی روداد بھی ہے۔ ''لوحِ ایام'' زندگی کے رزمیے میں بھرپور شرکت کے بعد کے بیان پر مشتمل ہے، یعنی ''لوحِ ایام'' ایک متین، سنجیدہ اور بصیرت افروز خودنوشت ہے۔ سوانحی حیات اور تجربات ومشاہدات کے بیان میں انتہائی دھیما انداز، انکسار و معروضیت، انا پرستی اور خود پروری سے پرہیز اور سادگی نے خودنوشت کو ناول سے زیادہ دلچسپ اور زندگی سے زیادہ حقیقی بنادیا ہے۔ غرض ''لوحِ ایام'' ایک فرد کی کہانی نہیں بلکہ افراد کی داستان ہے۔ اس کے بین السطور میں وہ آگہی اور شعور ہے جو تفکر وتعقل کے ہزار ہا در یچے روشن کرتا اور قوموں میں بصیرت وبیداری کے چراغ روشن کرتا ہے۔

مختار مسعود کی خودنوشت نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اس نکتے کو مرکزیت حاصل ہے کہ انہوں نے مکمل حالاتِ زندگی قرطاس پر لانے کی بجائے حالات کو زمانی قید سے آزاد کراتے ہوئے فسانۂ زندگی سنانا مقصود سمجھا ہے، اسی لیے انہوں نے کچھ واقعاتِ زیست کو قاری کی امانت بنایا ہے۔ یہاں ان کی خودنوشت نگاری کا اجمالی جائزہ نہیں صرف اس طرف توجہ دلانا مقصود تھا۔

(ب) مختار مسعود کی سوانح نگاری

مختار مسعود کے نثری کمالات سوانح نگاری رشخصیت نگاری میں خوب کھل کر سامنے آتے ہیں یہ نگارشات اگر یکجا کی جائیں تو سوانح نگاری کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔ مختار مسعود

نے سوانح نگاری کی صنف میں اپنے قلم سے تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ درحقیقت مختار مسعود کے پاس شخصیت اور شخصیت کی ظاہری اور کرداری نقشہ کشی کی خاصی پختہ صلاحیت موجود ہے۔ مختار مسعود نے جن شخصیات سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے، ان کے متعلق محض ایک یا دو فقروں میں ایسی تصویر کھینچی ہے کہ وہ شخص اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت قاری کے روبرو آن کھڑا ہوتا ہے۔ زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو سوانح عمری کا پہلا عکس، اُن کی کتاب 'آوازِ دوست' میں محمد ابراہیم شا کیوچن ۱۴ کا ملتا ہے۔

''میں نے والد محترم سے رہنمائی چاہی تو ہدایت ملی کہ آٹوگراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورق سادہ انہیں یونہی نہیں بھرنا چاہیے، جاؤ نگہ انتخاب کو کام میں لاؤ، بڑے آدمی، زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ ان سے تعارف کے لیے ''کارلائل'' سے مدد مانگو، ان سے ملاقات کے لیے ''پلوٹارک'' کے پاس جاؤ۔ ان کو سمجھنے کے لیے ''سعدی'' سے لے کر ''سیموئل'' تک سب کے دروازے پر دستک دو۔'' ۱۵

جب کہ انہوں نے جامع سوانح ''ڈاکٹر فضل الرحمان'' کی تحریر کی ہے یہ ان کی کتاب ''سفر نصیب'' میں شامل ہے۔

''وہ حکومت کے قوانین کا مطالعہ کر رہے تھے تو ان کی نظر ایک شق پر جم کر رہ گئی جس کی رو سے ہر سرکاری ملازم کو دس برس کی ملازمت کے بعد تاحیات پنشن کا حق حاصل تھا فضل الرحمان کے لیے پچیس چھبیس برس کی عمر میں پنشن یافتہ ہو جانے کا تجربہ بڑی کشش رکھتا تھا۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ایک شلنگ چھے پنس (Pence) ایک روپیہ کی شرح سے کوئی ستر روپیہ ماہانہ ملیں گے۔ ان دنوں یہ رقم بہت بڑی نہ سہی خاصی معقول ضرور تھی۔ فضل الرحمان چھٹی لے کر افریقہ اور یورپ کی سیر پر

روانہ ہوگئے۔ سمندر کے سفر کے دوران ان کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات آنے لگے۔ انسان کب تک سمندر کے کنارے سیپیاں جمع کرنے میں مشغول رہے گا۔''۱۶

''میں پہلے دن سے فضل الرحمان کا طرفدار تھا جب دوسرے بحث میں مار کھاتے اور معلومات میں پیچھے رہ جاتے تو میرا سر اونچا ہو جاتا فضل الرحمان سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے، مسعود میاں پڑھنے کے لیے تمھیں سب کہیں گے مگر سیر وسیاحت کے لیے کہنے والا شاید میرے سوا تمھیں کوئی نہیں ملے گا۔ سیر وسیاحت کے بغیر زندگی بسر کرنا نباتات کی مجبوری ہے مگر اشرف المخلوقات کا شیوہ نہیں، سفر اور علم دو حقیقتیں ہیں۔''۱۷

''فضل الرحمان بولے میں جماعت میں اوّل آگیا ہوں میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے سوچتا ہوں تھوڑی سی ہمت اور کرلوں اور تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے انگلستان کیوں نہ چلا جاؤں۔ فضل الرحمان نے پھر ایک بار لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔''۱۸

''فضل الرحمان انگلستان پہنچے۔ آکسفورڈ سے پہلا خط آیا، اپنی ابتدائی تعلیم کا منصوبہ درج تھا۔ دوسرا خط ملنے سے پہلے دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ رابطہ کم ہوتا چلا گیا اور پھر بالکل ٹوٹ گیا۔''۱۹

''فضل الرحمان تنہا اور بے یار ومددگار تھے پنشن قلیل تھی اور جنگ کے دوران اس کا ہر ماہ زنجیار سے انگلستان پہنچنا ناممکن تھا جو رقم لے کر گئے تھے وہ امن کے سستے دنوں کے حساب سے کافی تھی مگر ایک طویل جنگ اور اس کی لائی ہوئی مہنگائی کے سامنے آخر کتنی دیر ٹھہر سکتی تھی۔''۲۰

مختار مسعود نے معاشرے کے عام لیکن کسی خاص وصف کی بنا پر معروف لیکن مثالی کرداروں

کو بھی اپنی سوانح نگاری کا موضوع بنایا ہے (گردیال سنگھ، آتما سنگھ) یہ دونوں ان کے ہم جماعت تھے جن کے بارے میں کچھ یوں قلم اٹھاتے ہیں:

"میرے ہم عصر سکھ طلبہ کا ذکر گردیال سنگھ اور آتما سنگھ کے بغیر ناممکن رہے گا یہ دونوں پڑھائی میں ایسے ویسے مگر کھیلوں میں بہت ممتاز تھے گردیال سنگھ پیراک تھے اور آتما سنگھ دوڑاک۔" ۲۱

"سالوں گردیال جیسا ماہی صفت نوجوان دیکھنے میں نہیں آیا، فری اسٹائل کا ماہر تھا، اس کے تیرتے ہوئے پانی اچھلتا نہ کوئی آواز آتی، پانی خاموشی سے اُسے جانے کے لیے راستہ دے دیتا، وہ خاموش اور کم گو لڑکا اپنے کام سے کام رکھتا وقت ضائع کرنے کے خلاف تھا سالانہ مقابلے میں بہت سے انعامات حاصل کیے اور چمپئن قرار پایا۔" ۲۲

"آتما سنگھ اچھے ایتھلیٹ اور لاپرواطالب علم، میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی اس کی بڑی وجہ اب سمجھ میں آتی ہے۔ آتما نے صرف ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا تھا جس کی تعلیم شام کو ہوتی تھی۔ وہ دن بھر SpikeShoe اٹھائے پھرتے تھے، اسپورٹس کے وہ جوتے جن کے تلے میں نوک دار میخیں لگی ہوتی ہیں۔" ۲۳

مختار مسعود کی سوانحِ نگاری کا اسلوب زبان و بیان کے لحاظ سے منفرد ہی نہیں بلکہ دلکش بھی ہے جسے پڑھتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہتا، حسرت موہانی کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

"میں نے حسرت کو پہلی بار شاعر کی حیثیت سے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا، وضع قطع بے ڈھب، جسم بے ڈول، لباس بے طور، آواز ناخوش۔ ان کی ذات میں اتنا کھردرا پن نظر آیا کہ پاس جاتے ہی چھل

جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا، شاعرانہ بانکپن کا ان کی صورت شکل اور رہن سہن سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ تعجب ہوتا کہ نازک خیالی اور شوخی نے اپنے ٹھکانے کے لیے کیسا اُجاڑ مکان منتخب کیا ہے۔''۲۴

''ایک بار گرفتاری کا یہ منظر تھا کہ یہ جلسہ گاہ میں زمین پر منہ کے بل گرے ہوئے تھے، پولیس کے کچھ سپاہی مار رہے اور کچھ اُٹھا رہے تھے کچھ بن نہ پڑا تو زمین پر اُگی ہوئی گھاس کو پکڑلیا، اور جب انہیں اٹھایا گیا تو گھاس بھی جڑ سے اُکھڑ آئی، ذرا سی دیر میں پولیس کی لاری پر یوں لادے گئے جیسے بار برداری کا سامان لادا جاتا ہے، اس وقت ان کی زبان پر انقلاب زندہ باد کا نعرہ تھا، اور دونوں مٹھیوں میں گھاس۔''۲۵

''یہ شخص بھی عجیب ہے چار بار جیل ہوئی، گیارہ حج کیے، اور تیرا دیوان شاعری کے مرتب کیے، سیاسی ہنگاموں کا حساب اور عوامی تحریکوں کا شمار ناممکن ہے، ملک کے لیے آزادی مانگی تو کالج سے نکالے اور حوالات میں داخل کیے گئے ۔ کتب خانہ اور اردوئے معلیٰ ضبط ہوا، نایاب قلمی نسخے پولیس ٹھیلوں پر لاد کر لے گئی۔ مسودات ان کے سامنے جلائے گئے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی گئیں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔''۲۶

مختار مسعود کے منفرد اور رواں اسلوب پر ''حرفِ شوق'' کے حوالے سے ظفر حسین ظفر اپنے ایک مضمون میں یوں لکھتے ہیں کہ:

''برعظیم میں مسلمانوں کے عہدِ زوال اور پھر اس سے نکلنے کے لیے کی گئی تدابیر میں سر سید اور علی گڑھ کے کرداروں کو جس عمدگی اور جامعیت کے ساتھ مختار مسعود نے بیان کیا ہے۔ سچ ہے ''انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادؔ''۔ ''حرفِ شوق'' میں علی گڑھ کے سنگ وخشت کا ذکر بھی

اس عمدگی سے کیا ہے کہ وہ زبانِ حال سے اپنی داستان آپ ہی سنا رہے ہیں۔ جیسے اسٹریچی ہال کی تعمیر کے مختلف مراحل اور پھر اس کثیر المقاصد ہال کے مصرف کا بیان ایک ایسی داستان ہے کہ پڑھتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ یہ دراز ہوتی رہے۔ ''ماضی کے ساتھ ایک نشست'' سب سے طویل مضمون ہے، جس میں مختار مسعود نے علی گڑھ کی فضاؤں میں گزرے اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ایام کو آواز دی ہے یہ محض آپ بیتی نہیں بلکہ اس میں علی گڑھ کے نام ور اساتذہ، نمایاں طلبہ، تعلیمی ماحول، یونین کی سرگرمیوں، باہر سے آنے والے قائدین کے خطابات، مباحثوں اور تقریری مقابلوں کی روداد، اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ یہ کسی فرد کی داستان نہیں بلکہ مسلم تاریخ ایک عہد کا روشن حوالہ بن گئی ہے۔ علی گڑھ اولڈ بوائز کی یادیں، رسائل وجرائد میں اکثر اشاعت پزیر ہوتی رہتی ہیں، لیکن مختار مسعود نے ایسی منظرکشی کی ہے کہ قاری بھی عہدِ سرسید میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ علی گڑھ شاید واحد تعلیمی ادارہ ہے جس کے وابستگان کے لیے آج بھی سب سے بڑا اعزاز ''علیگ'' ہونا ہے۔ جس طرح رومی امپائر کے عروج کے زمانے میں اہل روما کے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ ''میں رومی شہری ہوں'' اس طرح سرسید کے علی گڑھ سے وابسطہ افراد کے لیے ساری زندگی یہی بات باعث فخر رہی کہ میں ''علیگ'' ہوں۔ مختار مسعود نے کئی علیگ دوستوں کا تذکرہ گاہے تفصیل گاہے اجمال سے کیا ہے، لیکن اپنے مضمون کا اختتام تین نامور علیگ دوستوں کے ذکرِ خیر پر کیا ہے۔ جنھوں نے تعلیم و تحقیق کے میدان میں غیر معمولی نام کمایا، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر زوار حسین زیدی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔ یہ

تینوں ہم عصر اور ہم طالع، اچھے طالب علم اور مثالی اور کامیاب معلم، اگر نسل نو کے لیے رول ماڈل نہیں ہوں گے تو پھر کون ہوگا؟'' ۲۷

مختار مسعود کی سوانح نگاری کا تنوع خصوصیت کا حامل ہے سماج کے ہر طبقے کی نمائندگی ان کے یہاں موجود ہے مثال کے طور پر بھیم جی رام جی امبید کر (اچھوتوں کے فادر آف دی نیشن) کی سوانح کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''امبید کر کولمبیا یونی ورسٹی سے پڑھ کر واپس آیا، بڑودہ ریاست کے شودر مہاراجہ نے اسے ایک عہدہ دے دیا۔ عہدہ دار کی حالت یہ تھی کہ اس کے ادنیٰ ماتحت اس کو پینے کے لیے پانی دینے کے روادار نہ تھے، جو پڑھے لکھے تھے وہ اسے کاغذ بھی دور سے دکھاتے تھے وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلا گیا۔ ایم اے کیا، پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس مکمل کیا بیرسٹری کی سند حاصل کی، وہ اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے والا پہلا اچھوت نوجوان تھا، اس کے لیے اُس نے سب سے آسان راہ یہ اختیار کی تھی کہ وہ انگلستان کے بے تعصب ماحول میں باوقار زندگی بسر کرتا اور پیشہ ورانہ بلندیاں سر کرتا، اس نے ہندوستان واپس آنے کو ترجیح دی۔ اس پیدائشی شودر نے وکالت شروع کر دی اس نے ساری زندگی ایک مقدمہ لڑنے میں صرف کر دی۔ یہ اچھوتوں کا مقدمہ تھا۔'' ۲۸

''مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی فضا بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبید کر کا استقبال محض رسمی اور روایتی نہیں ہوگا۔ انھیں خلوص اور احترام کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے گا۔ اس کے محرکات میں جذبۂ احسان مندی، توقعات اور خوش فہمی شامل ہیں۔ ایک زیریں لہر اس احساس کی بھی ہے کہ برعظیم کی سیاست میں مسلمان تنہا ہیں۔ دوسری اقلیتوں کو اگر وہ اپنے ساتھ

ملا نہیں سکتے تو کم از کم انھیں غیر جانبدار رہنے کی ترغیب تو دے سکتے ہیں۔'' ۲۹؎

''امبیدکر علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ شودر ہندو رہتے ہوئے کبھی برابری حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ ہندوازم کی بنیاد ہی نابرابری پر رکھی گئی ہے، اپنے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ میں بھیم جی رام جی امبیدکر پیدائشی ہندو اچھوت ہوں۔ ذیلی ذات مہار ہے۔ یہ میرے بس میں نہ تھا کہ اس کا تدارک کر سکتا البتہ یہ تو میرے بس میں ہے کہ میں افتادگی کے احساس حقارت اور شکستہ نفسی کے ماحول میں زندگی بسر کرنے سے انکار کردوں۔ میں ہندو پیدا ہوا تھا مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ مرنے کے وقت میں ہندو نہیں ہوں گا۔'' ۳۰؎

سوانحی نگارشات سے مختار مسعود کا ایک مخفی پہلو سامنے آتا ہے عام طور پر انہیں دنیا دار بیوروکریٹ جانا جاتا ہے لیکن ان کے اندر کا انسان بالکل مختلف ہے۔ جس کا ادراک خواجہ حسن نظامی پر لکھے ہوئے ان جملوں سے ہوتا ہے:

''ایسے یگانہ روزگار شخص کی تقلید کیسے ممکن ہے۔ جس کے لیے اردو ایک درگاہ تھی، محاورے مجاور اور انشائیہ متولی۔'' ۳۱؎

''وہ کونسی بات ہوگی جو ان کے مشاہدے میں آئی اور ان کے قلم کی گرفت سے بچ گئی۔ وہ ایک جھینگر کی موت سے متاثر ہو کر پکار اٹھے جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔'' ۳۲؎

انہوں نے تاریخ ساز شخصیت کی سوانح نگاری کو بھی اپنے اسلوبِ نگارش سے دلچسپ اور متاثر کن بنایا جس کے پڑھنے سے ہمیں نہ صرف اس شخص بلکہ اس کے عہد سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے، جو ہماری معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں، قائدِ اعظم کے بارے میں یوں رقم

طراز ہیں:

''قائداعظم کی تقلید اور پیروی آسان ہے مگر ان کے نقشِ قدم پر چلنا بہت دشوار ہے قائداعظم کی زندگی میں ان کے چاہنے والے اور ماننے والے ان گنت تھے وہ اپنی زندگی کچھ اس طور سے کر گئے کہ ان کے انتقال کو خواہ کتنی ہی مدت گزر جائے برعظیم میں ان کے پیروکار کم نہ ہوں گے۔ یہ بھی ایک کرشمہ ہے علم سیاسیات میں کامیاب رہنما کی خوبیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اگر دقت پیش آئے تو گرفت میں نہ آنے والی خوبیوں کو کرشمہ کہہ کر فہرست مکمل کر لیتے ہیں۔ قائداعظم کوئی حل نہ ہونے والا معمہ یا سمجھ میں نہ آنے والا اتفاقی حادثہ نہ تھے ان کی بڑائی تو اس بات میں تھی کہ لوگ ان کے بارے میں سب کچھ جاننے ہی کی وجہ سے انھیں ایک بلند طبع شخصیت مانتے۔''[۳۳]

''قائدِاعظم کی جانی پہچانی ذات میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو سمجھ میں نہ آئے، شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کی خاص خاص خوبیوں کی فہرست کچھ یوں بنے گی عزم، علم، دیانت، خطابت اور خودداری، ان کا عزم وہ تھا جسے یقینِ محکم کہتے ہیں۔ ان کے عمل کا نام عملِ پیہم تھا۔ ان کی دیانت کو شاعر نے مشربِ ناب اور ان کی خطابت کو سخنِ دلنواز کہا ہے۔''[۳۴]

علی گڑھ یونی ورسٹی کے ماحول میں مختار مسعود کے کئی جوہر نکھرے ان میں ایک فنِ خطابت و صحافت بھی تھا۔ دورِ طالب علمی میں مسلم لیگ کے کئی رہنماؤں کی تقاریر براہِ راست سننے کے مواقع انہیں میسر آئے انہی میں ایک شعلہ بیان، تحریک پاکستان کے رہنما ریاست حیدر آباد دکن کے نواب بہادر یار جنگ کی قوتِ اظہار کا اعتراف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''میں نے انہیں کئی بار سنا تھا ان کی تقریر کبھی آتش فشاں ہوتی اور کبھی آبشار، بعض تقریروں میں یہ دونوں صورتیں جمع ہو جاتیں، وہ تقریریں جن میں برعظیم کی آزادی اور پاکستان کا مطالبہ ہوتا یا فکر و عمل اور سرفروشی و جانبازی کی تلقین ہوتی بالکل آتش فشاں کی مانند ہوتیں۔'' ۳۵

''جو تقریریں اُسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ والہ وسلم)، مسلمانوں کی نا مسلمانی، ایمان کی کمزوری، اتحاد کی کمی، فکرِ صحیح سے محرومی اور راہِ حق سے انحراف کے بارے میں ہوتیں وہ ایسے آبشار کی طرح تھیں جو یہ کہتے ہوئے نیچے گر رہا ہو کہ اچھا تم میری سطح تک بلند نہیں ہوتے تو لو میں بلندیوں سے اتر کر تمھاری کشتِ ویراں کو سیراب کرتا ہوں۔'' ۳۶

''محمد بہادر خاں کی ساری زندگی صرف ایک محور کے گرد گھومتی رہی، جسے عشقِ رسولؐ کہتے ہیں ان کی زندگی سن و سال کے حساب سے قلیل تھی مگر اسے فکر کے لحاظ سے وقیع اور عمل کے لحاظ سے طویل کہہ سکتے ہیں۔'' ۳۷

مختار مسعود کا مشاہدہ و مطالعہ دورِ طالب علمی سے ہی انتہائی مثبت اور گہرا تھا نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ہی علی گڑھ کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی انہوں نے فعال حصہ لیا، یہ زمانہ برصغیر میں آزادی کی تحریک کا بڑا اہم مرحلہ تھا جہاں ہر نوجوان کی فکر و خیال اور نظریں اپنے قائدین کا پیچھا کرتی تھیں۔ ذہانت کردار اور سیاسی سوجھ بوجھ اور مالی ایثار و قربانی دینے والے جن زعما نے مختار مسعود پر گہرے نقش ثبت کیے ان میں راجہ صاحب محمود آباد کو خاص مقام حاصل ہے ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قائداعظم نے جب مسلم لیگ کو ازسرِ نو منظم کیا تو نوجوانوں کی ایک پوری نسل ان کے ہمراہ تھی۔ ان جوانوں میں سب سے طرح دار راجہ آف محمود آباد تھے۔'' ۳۸

”راجہ صاحب کو قدرت نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ صحت اور جوانی، دل اور دماغ، گفتار و کردار، درہم و دینار، تعلقہ داری اور عزاداری۔ ہمارا تعلق ان کی سیاست سے رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ راجہ صاحب بار ہا علی گڑھ آئے اور ہر بار ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔“ ۳۹؎

”جس راجا کا ذکر کر رہا ہوں وہ شریف اور نحیف ہیں اور ان کا تعلق اودھ کی تعلق داری اور لکھنو کے امام باڑے سے ہے، ان کے والد ایک درد مند مسلمان رہنما تھے، ان کے انتقال کے بعد نوجوان راجہ کو جاگیر اور سیاست ورثے میں ملی، کچھ ترکہ درد مندی اور ہوشمندی کا بھی ان کے حصے میں آیا۔ وہ جاگیر بھارت میں چھوڑ آئے، سیاست پاکستان آکر ترک کردی، ہوشمندی ہنوز ان کے ساتھ ہے، درد مندی کا اب پتہ نہیں ملتا۔“ ۴۰؎

مختار مسعود میں انسانوں کو سمجھنے اور ان کے کردار کا تجزیہ کرنے کی خداداد صلاحیت تھی وہ چھوٹی سی بات کے پیچھے چھپے شخص کے قول و فعل کو بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے اس کا ایک رنگ بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں کی سوانح کے بارے میں لکھے اس شہ پارے میں ملتا ہے:

”تقریر شروع ہوئی تو حمید اللہ خاں نے کہا کہ طالب علمی کا سنہرا دور ختم ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب میں اولڈ بوائے کہلاتا ہوں مگر اس درس گاہ کی فضا میں نہ جانے وہ کون سی خاصیت ہے کہ جونہی یہاں قدم رکھتا ہوں گزرا ہوا زمانہ الٹے پاؤں لوٹ آتا ہے۔ ابھی یونین ہال میں بیٹھے ہوئے مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کی ایک تقریر یاد آئی۔ سارا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا اور الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ ایسے لگا جیسے میں نے وہ تقریر

ابھی کی ہو۔اس وقت میں حیران ہوں کہ آپ نے مجھے فوراً ہی دوبارہ تقریر

کے لیے کیوں بلالیا ہے۔''۴۱؎

برطانوی راج میں برصغیر کی سیاست اور سماج پر'' A passage to india'' جیسے معرکۃ الآرا ناول کے مصنف ای۔ایم فاسٹر سے ملاقات میں مختار مسعود کو اس کے فن اور شخصیت سے قریب کر دیا یہ قربت اس کے سوانحی خدوخال کو یوں بیان کرتی ہے:

''یہ بوڑھا ایک انگریزی ناول نگار تھا جو دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے چند ماہ بعد علی گڑھ آیا تھا۔''۴۲؎

''اس کے انداز میں ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جیسے غم، غربت اور جہالت نے کبھی اس کا راستہ نہ کاٹا ہو۔ ہلکے سفید بال، نیلی آنکھیں اور چھوٹی سی دھنسی ہوئی ٹھوڑی، اس کے اردگرد خود اعتمادی اور خوشگواری کا ایک ایسا ہالہ تھا جو کامیاب زندگی اور مطمئن دل کا عطیہ ہوتا ہے۔''۴۳؎

''فاسٹر کی ذات کے گرد کوئی کم ظرف اجارہ دار نہ تھا، اس کے پاس ہر عمر اور ہر قسم کے لوگ بلا روک ٹوک آتے جاتے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا۔ اس نے ایک بار شکوہ کیا کہ اس کے پاس آنے والوں میں باتیں بنانے والے تو بہت ہیں مگر خوش گفتار کم یاب ہوتے جا رہے ہیں۔''۴۴؎

''آٹو گراف البم کے دسویں صفحے پر ای۔ایم فاسٹر کے دستخط ہیں، خط واجبی سا ہے، لکھائی گنجلک، سارے الفاظ ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں۔ دستخط کی نشست بھی درست نہیں۔ یہ دستخط میں نے یونین ہال میں حاصل کیے تھے وہ سال ۱۹۴۵ء تھا، اور نومبر کی تیسری تاریخ تھی۔''۴۵؎

جہاں انہوں نے ممتاز ہندوستانی مرد رہنماؤں کی سوانح لکھی وہیں وہ ممتاز کانگریسی رہنما، برصغیر کی سیاست میں انتہائی اہم کردار کی حامل ''سروجنی نائیڈو'' کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو

بڑی چابکدستی سے اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دبلی پتلی، بوٹا قد، تنگ دہن، آنکھیں کشادہ اور روشن، بالوں میں گھنگھر ہیں اور چھوٹا سا جوڑا گردن میں ڈھلکا ہوا ہے، جوڑے میں جڑاؤ پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار، بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے، ساڑھی کا پلو کاندھے پر کلپ سے بندھا ہوا ہے صورت من موہنی، پہلی نظر میں پُر اثر، دوسری میں پُر اسرار۔''[۴۶]

اگر یہ کہا جائے کہ سروجنی نائیڈو کے روپ اور شخصیت کا گہرا مشاہدہ مختار مسعود ان کی سوانح میں قلم بند کرتے ہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا ملاحظہ کیجیے:

''میں نے جب اس بُت کو دوسری بار نظر بھر کر دیکھا تو صورت ہی بدلی ہوئی تھی، ایک بھاری سانولی اور معمر عورت نے سلک کی سلیٹی ساڑھی باندھی ہے پلو سر پر ہے اور نصف چہرہ بھی اس میں چھپا ہوا ہے اس نے دائیں ہاتھ سے ایک خوشنما قوس بنائی اور اسے ابرو کے سامنے لاکر سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے اراکین کو جو وکٹوریا گیٹ میں صف بستہ کھڑے تھے یوں آداب کیا گویا وہ مسلم تمدن کا مرقع ہے یا شائستگی کا مجسمہ، آداب کرتے ہوئے ساڑھی کا پلو چہرے سے ڈھلک گیا تو ہم نے پہچانا کہ یہ سروجنی نائیڈو ہے۔''[۴۷]

سروجنی کی شخصیت کے تہہ دار پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے وہ کسی مہمان کی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ آمد پر علی گڑھ کی تہذیب و ثقافت کو بڑے دلنشین پیرائے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سروجنی جب یونین ہال میں تقریر کرنے کے لیے کھڑی ہوئیں تو ان پر گل پاشی کی گئی یونین ہال کی اس رسم کا جواب میں نے کہیں نہیں دیکھا،

بڑے بڑے ملکوں کے بڑے بڑے استقبال دیکھے، جاہ وحشم اور شان و شوکت کی کہیں کمی نہ تھی مگر پھر بھی جو حسن اور سادگی یونین ہال کی گل پاشی میں ہے اس کی یکتائی کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔'' ۴۸ؔ

مختار مسعود کا قلم سوانح لکھتے ہوئے متعصب نہیں ہوتا۔ بلکہ انتہائی ایمانداری سے سوانحی تقاضے کو پورا کرتا ہے اس کا خوب صورت اظہار کچھ یوں ہوتا ہے:

''آج گل پاشی سروجنی پر ہوئی، دیکھنے والوں نے گل و بلبل کا یہ نیا رشتہ بھی دیکھا، گل تھا کہ آج بلبل پہ نثار ہو رہا تھا۔ بلبل کی باری آئی تو اس نے کہا، میں آج ایک طویل مدت کے بعد یونین ہال میں آئی ہوں، پھولوں کی لڑیاں اور جوشیلے نوجوانوں کے جذبات کی کڑیاں ہی اس مدت کے دونوں سروں کو آپس میں ملاتی ہیں ہم نے پھول برسائے تھے سروجنی نے جواب میں موتی لٹانے شروع کر دیے۔'' ۴۹ؔ

مختار مسعود کا طبعی رجحان تاریخِ انسانی کے تغیرات کے ان پسِ پردہ فلسفہ و منطق سے ابھرنے والے نئے سوالات و امکانات کے مطالعے سے لگن کھاتا ہے جو ان کے قلم کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔ ملتان میں تعیناتی کے دوران انہیں نامور انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور اس کے افکار پر اس سے گفتگو کا موقع میسر آیا تو اس کی سوانح کے فنی محاسن کو انہوں نے جس خوبصورتی سے قلم بند کیا وہ ان کے منفرد سوانح نگار ہونے کی دلیل ہے:

''میں نے جب انہیں ملتان میں اپنے سامنے بیٹھا ہوا پایا تو ان کی فکر جواں تھی اور ان کے چہرے پر وہ نکھار تھا جو صرف اس بڑھاپے میں پیدا ہوتا ہے جس کی جوانی ایک کامیاب ریاضت اور تپسیا میں گزری ہو ان کے چہرے پر بار بار مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔'' ۵۰ؔ

''تہذیب کی ابتدا کے بارے میں ٹائن بی نے نظریہ مجاہدہ پیش کیا ہے اس

کا خیال ہے کہ مشکلات سے مقابلہ کرتے ہوئے جب کوئی معاشرہ فتح حاصل کرتا ہے تو تہذیب کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔''[۵۱]

مختار مسعود کے سوانحی شہ پاروں میں ''تاریخ'' ان کا اہم موضوع رہا ہے جس کی ایک وجہ تاریخ میں ان کی عدم دلچسپی کا عنصر نمایاں ہے۔ جس کی بنا پر وہ مشہور و معروف مورخ آرنلڈ ٹائن۔ بی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ٹائن بی کی اہمیت اس کی شہرت سے زیادہ ہے مگر یہ اہمیت اور شہرت دونوں اس کی کتاب ''تاریخ کا ایک مطالعہ'' پر مبنی ہیں۔ اس کتاب کا موضوع کسی عہد یا علاقے کی تاریخ نہیں بلکہ تاریخِ عالم اور تاریخِ انسانی کا ایک ایسا جائزہ ہے جس کی رو سے ایک نیا فلسفۂ تاریخ قائم ہوتا ہے۔ ٹائن بی کے فلسفۂ تاریخ کا حاصل یہ ہے کہ تاریخ کے مطالعے کے لیے موزوں اکائی نہ ملکوں کی غیر مستقل سرحدیں ہیں نہ ان کی عارضی حکمرانیاں، بلکہ تہذیب یا معاشرہ ہے۔''[۵۲]

مختار مسعود کا حافظہ بلا کا اور نوعمری کے مشاہدے بھی قرطاسِ ذہن پر کئی عشرے گزرنے کے باوجود تازہ تھے، حافظے اور مشاہدے کا یہ امتزاج مولانا ظفر علی خاں کے سوانحی شہ پارے میں بدرجہ اتم موجود ہے ملاحظہ کیجیے:

''مولانا ظفر علی خاں کو میں نے پہلی بار علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، مدیر اور شاعر، بدیہہ گو اور نعت گو، خطیب اور باغی، وفاکش اور جفاکش، سیمابی اور ہنگامہ پرور، کہنے والے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر برعظیم میں کسی تحریک کی بنا ڈالنی ہو تو ظفر علی خاں سے کوئی بہتر شخص نہیں ملے گا۔''[۵۳]

''جب انھیں دیکھا تو وہ ایک تحریک کے معمار کی حیثیت سے یونین ہال

میں بیٹھے تھے، ان کی ٹوپی کا پھندنا جھٹکے کے ساتھ ہلتا تھا۔ ہاتھ بھی ہر وقت حرکت میں تھے اور پہلو بھی بار بار بدلتے تھے نچلا بیٹھنا تو شاید ان کو آتا ہی نہ تھا جب تقریر کے لیے ان کا نام پکارا گیا تو گویا انھیں چین آ گیا۔" ۵۴؎

"ظفر علی خاں کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ جس مضمون نے ذرا سا اکسا دیا اس پر فوراً شعر کہہ ڈالتے۔" ۵۵؎

"مولانا ظفر علی خاں کو میں نے آخری بار مری میں دیکھا تھا، کمشنر ہاؤس کے نزدیک ایک پھاٹک پر ان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، بوڑھے اور علیل ظفر علی خاں کا بس نام ہی رہ گیا تھا کام ان کا پورا ہو چکا تھا۔" ۵۶؎

مختار مسعود کی زندگی میں علی گڑھ کے اساتذہ کا گہرا اثر رہا۔ خاص کر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ایسے اساتذہ تھے جن کی قربتِ خاص نے ان کے فکر و خیال پر جو اثرات مرتب کیے اس سے انہوں نے اپنی عملی زندگی میں ہمیشہ استفادہ کیا ان دونوں اساتذہ سے انہیں جو لگاؤ تھا وہ ان دونوں اساتذہ کی سوانح لکھتے ہوئے اظہر من الشمس ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"رشید صاحب دن میں کئی بار نظر آتے۔ دبلے پتلے اور لمبے۔ گول گول شیشوں کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھیں جنھیں وہ جھکا لیتے تو لگتا جیسے سر اور کندھے بھی جھکے ہوئے ہیں۔ انہیں پیدل چلتے ہوئے بہت کم دیکھا۔ سائیکل کے بغیر نامکمل لگتے۔ صبح سوار ہو کر شعبۂ اردو جاتے اور شام کو اولڈ بوائز لاج۔ سائیکل تیز چلانے کے خلاف تھے۔ دھیما پن ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا۔ وہ جو ہمیں سویا سویا اور کھویا کھویا سا آدمی لگتا تھا وہ اپنے ابتدائی اور وسطی دور کی تحریروں میں اتنا بیدار، چلبلا، زندہ دل، چست و چاق نظر آیا کہ اس تجربہ کے بعد ہم نے چشم ظاہر بین پر کبھی اعتبار اور اعتماد

نہیں کیا۔ انسان ہوں کہ کواکب، جو نظر آتے ہیں ویسے نہیں ہوتے۔'' ۵۷

''رشید صاحب کو جب میں نے پہلے پہل دیکھا تو ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت مسلم یونی ورسٹی کی حدود سے نکل کر تھوڑی دور تک ہی گئی ہوگی۔ یہ شہرت گاہ بگاہ لکھے ہوئے ان مختصر مضامین کی بدولت تھی جو علی گڑھ میگزین کے علاوہ اِدھر اُدھر رسالوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اس شہرت کو پہلے آہستہ آہستہ اپنے قدم جماتے اور پھر یکا یک دور دراز کے علاقوں کو فتح کرتے دیکھا۔'' ۵۸

''رشید احمد صدیقی کا گھر ایک اور اعتبار سے دوسرے تمام گھروں سے مختلف تھا ان کے قطعۂ زمین کے مغربی جانب کنارے پر بڑا کنواں تھا۔ رشید صاحب نے مکان کی دیوار میں خم دیا اور کنوئیں کو گھر میں شامل کرنے کی بجائے چار دیواری کے باہر رہنے دیا تا کہ لوگ آزادی سے اس کا پانی استعمال کرسکیں۔ نہ منڈیر پر تختی لگی کہ یہ شارع عام نہیں ہے نہ کنویں پر کہیں لکھا تھا کہ آبی ذخیرہ کے جملہ حقوق بحق مصنف خنداں محفوظ۔ اس نیک کام کی ہر ایک نے دل کھول کر داد دی۔'' ۵۹

مختار مسعود کا اپنے شفیق استاد ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کے بارے میں سوانحی اسلوب ملاحظہ کیجیے:

''مسلم یونی ورسٹی میں شعبہ معاشیات کے صدر ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو بڑے بارعب نظر آئے۔ یہ شروع کے دنوں کی بات ہے اور اب اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے میں لڑکپن کی سرحد کے پار زمینِ بے یاری کا مسافر تھا۔ جسم دبلا، نرخرہ بے قابو، آواز بے سری اور قد لانبا لمبے ہونے کی رفتار یہ تھی ہر تین چار ماہ بعد ٹخنے پائنچوں سے جھانکنے

لگتے۔ ادھر ایک عمر رسیدہ، سنجیدہ اور جہاں دیدہ آدمی۔ ایک فربہ کم گو اور بھاری بھرکم شخصیت۔ یورپ میں پڑھا ہوا اور انگریز حکومت کا مانا ہوا ماہر معاشیات۔ ہیرس ٹویڈ کا چارخانہ کوٹ اور برجس نما پلس فور پہننے والا شخص جو عید کے روز شلوار قمیض اور مشہدی کلاہ و دستار میں نظر آتا۔ ایک سہ پہر گالف سٹک لے کر بال اٹھانے والے پیش خدمتی کے ساتھ پیدل چلنے والا اور دوسری سہ پہر جرمن میم کے ہمراہ گھڑسواری کرنے والا صاحب۔''[۶۰]

''ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کی کوٹھی میں خاموشی قدرے زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور سٹیفنی دونوں خاموش طبع اور کم آمیز تھے۔ جملہ اولاد ایک بچی پر مشتمل تھی جسے پانچ سال کی عمر میں انہوں نے شملہ بھیج دیا اور دس سال کی عمر میں انگلستان۔ شملہ کانونٹ میں داخل ہونے کے بعد اس بچی کا تعلق ہر اس چیز سے ٹوٹ گیا جو اسے باپ کی میراث میں مل سکتی۔ زبان، ملک، روایات، اور مذہب۔ البتہ شہسواری میں اس نے جلد ہی اتنا نام پیدا کیا کہ ایک ہاتھ میں کپ لیے اور دوسرے سے لگام تھامے اس کی تصویر ایک انگریزی روزنامہ میں چھپی۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ سرپٹ لندن پہنچ گیا۔''[۶۱]

''گرمیوں میں جب بہت سے (لوگ) پہاڑوں کا رخ کرتے ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ہاتھ کا پنکھا جھلا کرتے اور کھدر کا موٹا کرتہ پہن لیتے کہ وہ پسینہ چوس لیتا ہے۔''[۶۲]

''برگد تلے لکڑی کے دو چار گدے پڑے ہوتے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر صبح سویرے کلہاڑی لے کر لکڑی پھاڑنے کی ورزش کیا کرتے۔ چھٹیاں

ملازموں کے حصہ میں آتیں تاکہ وہ آگ تاپ سکیں اور چولہا گرم کرسکیں۔
صاحب بہادر کے حصے میں صرف وہ صحت مند خوشی آئی جو مسامات سے پسینہ کی صورت پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ایک نیک دل اور سادہ لکڑ ہارے تھے۔''[63]

''حیدر صاحب کے یہاں جو کھانا دونوں میاں بیوی کے لیے پکایا جاتا وہی ان تمام ملازمین میں تقسیم ہوتا، جو تنخواہ مع خوراک پر ملازم تھے۔ ان کا سفید ریش باتمیز خانساماں ہمیشہ دھوبی کے دھلے کلف لگے اجلے کپڑے پہنا کرتا۔''[64]

اپنے استادِ محترم ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کی فرض شناسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یونی ورسٹی کی ایک سڑک پر ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو پیدل جاتے دیکھا تو تانگہ روکا اور پولنگ اسٹیشن تک لے جانے کی پیشکش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے تانگہ میں بیٹھنے سے انکار کردیا کہنے لگے، رائے دہندگی کا حق اپنی خوشی سے استعمال کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں مسلم لیگ سے کسی قسم کی آسائش حاصل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے فرض کی ادائیگی کا معاوضہ وصول کیا اور اپنے آپ کو فروخت کردیا۔''[65]

مختار مسعود کی شخصی و علمی خوبیوں کی آبیاری میں سرسید احمد خاں اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید احمد خاں کی علمی و عملی پہلوؤں کو مختار مسعود کی زندگی میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سرسید کے نظریۂ حیات سے نہ صرف وہ متفق نظر آتے ہیں بلکہ اس کے مقلد ہیں وہ سرسید کی سوانح میں یوں رقم طراز ہیں:

''سرسید ایک بلند کردار انسان تھے۔ روشن خیال اور روشن دماغ شخص تھے، انہیں یقین تھا کہ اگر برعظیم کے مسلمان جدید مغربی تعلیم بالخصوص سائنسی

علوم اور تکنیکی فنون سے محروم رہیں گے تو ان کا کوئی سیاسی، معاشی اور معاشرتی مستقبل نہیں ہے۔ اسلام پر سرسید کا یقین کامل اور پُر خلوص تھا۔ انہوں نے اپنے تن، من اور دھن کو جدید تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ ان کا مدرسہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مثالی ادارہ بن گیا۔ ۱۸۸۳ء میں انڈین ایجوکیشنل کمشنرز نے اس رائے کا اظہار کیا کہ بعض معاملات کے لحاظ سے یہ ادارہ جس کے بانی سرسید احمد خاں ہیں ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں سے افضل ہے۔'' ۶۶

''سرسید کا مدرسہ مسلمانوں کی جدید انگریزی تعلیم کا پہلا ادارہ اور بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ جو کامیابی اور بارآوری اس مدرسہ کے حصے میں آئی ہے وہ برعظیم میں مسلمانوں کے کسی اور تعلیمی ادارہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ ایک چھوٹا سا مدرسہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تاریخ ساز ادارہ بن گیا، ایک پھوس کے بنگلہ میں شروع کیا ہوا ابتدائی مدرسہ پھیل کر مدینۃ العلم بن گیا۔'' ۶۷

مختار مسعود کی سرسید سے عقیدت و محبت اور ان کے مضمون ''سرسید احمد خاں کون تھے؟'' کے بارے میں ظفر حسین ظفر کا تجزیہ ملاحظہ کیجیے:

''وقت کا گھوڑا تیز رفتاری سے تاریخ کے کئی نشیب و فراز طے کر چکا ہے آج کی نئی نسل کو کیا معلوم کہ اگر سرسید نہ ہوتے اور علی گڑھ ہماری تاریخ کا ایک سنگِ میل نہ ہوتا تو پھر برصغیر کے مسلمان آج کہاں کھڑے ہوتے؟ پھر شبلی سے اقبال اور جناح تک مسلم تشخص کے علمبرداروں کی ایک کہکشاں کیسے وجود میں آتی۔ سرسید جب مطلع تاریخ پر طلوع ہوئے اس وقت برعظیم کے مسلمان اپنے زوال کی آخری حدوں تک پہنچ چکے تھے۔ مشہور انگریزی کا مورخ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے اپنی تصنیف: Our indian

Musalmans (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں تفصیل کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔

بقول ہنٹر: ایک سو ستر سال پہلے ایک خاندانی مسلمان کا نادار ہونا ناممکن تھا۔ آج (۱۸۷۱ء) اس کا خوشحال ہونا ناممکن ہے، اور سال (۱۸۷۱ء) میں (صدر مقام کلکتہ) میں کوئی سرکاری دفتر ایسا نہ تھا جہاں کسی مسلمان کو یہ امید ہو کہ وہ قلی، نائب قاصد، سیاہی کی دوات بھرنے والے یا قلم تراش سے بہتر درجہ ملازمت حاصل کر سکتا ہو۔ ایک ہزار سال تک حکومت اور اقتدار کی مالک قوم سات سمندر پار سے آئے ہوئے دکانداروں سے شکست پہ شکست کھائے جا رہی تھی۔ عیسائی مبلغین پوری آزادی کے ساتھ اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور مسلمانوں کے ہم وطن (ہندو) نہایت چالاکی کے ساتھ انگریزوں سے تعلقات استوار کرتے ہوئے زمینی حقائق کا مقابلہ کرنے کے لیے صف بندی کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر سویا ہوا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا تھا۔ ان حالات میں سر سید میدان میں اترے اور ایک ایسی علمی اور فکری تحریک کی بنیاد رکھی جس کے اثرات اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کو اس نے متاثر نہ کیا ہو"۔

مختار مسعود نے لکھا کہ:

"قدرت بعض معاملات میں بڑی بے لحاظ ہوتی ہے موقع ملے تو افراد ہی نہیں بلکہ قوموں اور ملکوں کے کپڑے بھی اتروا لیتی ہے اگر حافظہ اور حوصلہ ساتھ دے تو ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو یاد کر لیں۔" ۶۸

برصغیر کے مسلمانوں نے علم و آگہی کے لیے فروغِ علم کی جو تحریک پاکستان کے معروضِ وجود

میں آنے کا سبب بنی اس کے لیے سر سید کے علمی کردار اور گہری بصارت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سر سید کی خدمات کا جائزہ اس زمانے کے سیاق وسباق میں لیں تو دو باتیں بڑی نمایاں نظر آتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ سر سید نے برعظیم کے مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کے اسباب کے بارے میں ایک طویل مدت تک بڑی سنجیدگی سے غور کیا۔ زوال کا غم کھانا اپنی جگہ مگر اس کے سدِ باب کی فکر کرنا ایک روگ لگا لینے کی طرح تھا۔ اس سلسلے میں سر سید نے بڑی زحمت اٹھائی۔ اس زمانہ کی واحد سپر پاور کا مطالعاتی دورہ کیا تا کہ اس کی کامیابی کا راز جان سکے اور اس طرح بالواسطہ اپنے زوال کے اسباب تک پہنچ سکے۔ اس کی تحقیق کا حاصل یہ تھا برعظیم کے مسلمان علم کے حصول میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں جب تک وہ جہالت اور توہمات سے پیچھا نہیں چھڑاتے اس وقت تک ان کا مستقبل تاریک رہے گا۔ علم سے مراد علم نافع اور علم جدید تھا جو ان دنوں سوائے مغرب کے اور کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔'' ۶۹

''سر سید ایک معالج اور مصلح تھے، ان کا سب سے بڑا کام برعظیم کے انتہائی دقیانوسی مسلمانوں میں جدید ترین انگریزی (با الفاظ دیگر انسان شناسی کے نئے افکار اور سائنس کی) تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں ہے۔ اس محاذ پر سر سید کی بے مثال کامیابی نے مخالفین کے منہ بند تو نہیں کیے مگر ان کی مخالفت کی نوعیت بدل دی ہے۔'' ۷۰

مختار مسعود نے سر سید کی مسلمانوں کے لیے علمی اور شعوری جدوجہد کے بارے میں جو حقائق اپنی تصانیف میں پیش کیے اس پر ظفر حسین ظفر لکھتے ہیں:

''سر سید نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بنائی جس کے بطن سے مسلم لیگ پیدا ہوئی۔ سر سید کا زمانہ علوم وفنون کے احیا اور تجدید کا زمانہ تھا۔ اس دور میں

ہندی مسلمانوں کی ذہنی اور فکری تشکیل اس انداز سے ہوئی جس نے بعد
کے ادوار میں سیاسی آزادی کی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ سرسید کے
دیے ہوئے شعور کا نتیجہ تھا کہ مسلمانانِ ہند مخلوط انتخابات کی مخالفت، مسلم
یونی ورسٹی کے مطالبے، اور اردو زبان کے تحفظ، ملازمتوں میں تناسب کے
حصول وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی، ہائی کورٹ
اور چیف کورٹ میں نمائندگی اور قائدِ اعظم کے چودہ نکات جیسے مطالبات
سے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے۔ خطبہ الٰہ آباد سے ۲۳ / مارچ ۱۹۴۰ء کی
قرارداد اور پھر ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء تک پہنچے۔'' [اے]

سرسید کے اکثر ناقدین ان پر اسلام سے سرسری تعلق کا الزام لگاتے ہوئے انہیں سیکولر ثابت
کرنے کے لیے قوت صرف کرتے ہیں لیکن درحقیقت سرسید راسخ العقید مسلمان تھے اس بات کا
انکشاف راس مسعود کی سوانح میں مختار مسعود کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''پوتے کو دادا سے روپے کے علاوہ جو کچھ ملا تھا ہم اس کا ذکر کرنا چاہتے
ہیں، شاید تاریخ کو کچھ لحاظ آجائے اور وہ کچھ عرصے کے لیے ان نوادرات
کی حفاظت کرنے پر تیار ہو جائے۔ (بسم اللہ کے موقع پر سرسید نے (پوتا)
راس مسعود کو قرآن مجید کا ایک نسخہ، وظائف کے چند قلمی نسخے اور دیوانِ
حافظ کی ایک جلد ہبہ کی تھی)۔'' [۲ے]

''بمبئی کے اخبار انقلاب نے افتتاحیہ میں ایک ماہر تعلیم کے حوالے سے لکھا
ہے کہ اگر سرسید ہندو ہوتے تو برادرانِ وطن ان کو کرشن کا اوتار مانتے اور
ان کی پوجا کرتے مگر مسلم قوم نے جتنی ہوسکتی تھی ان کی ناقدری کی۔
مسلمانانِ ہند کو مدرسہ کی سالگرہ تو کیا، سرسید کا جنم دن بھی بھول گیا ہے یہ
تاریخی حقیقت ہے کہ جب قوم اپنے رہنماؤں کو بھلا دیتی ہے تو دنیا کو کیا

پڑی ہے کہ انھیں یاد رکھے۔ دوسرے بھی انھیں بھلا دیتے ہیں۔ اخبار
والے شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو قوم اپنی تاریخ کو بھلا دے، تاریخ اس کو
بھلا دیتی ہے۔ تاریخ کے بھلا دینے اور مٹا دینے میں کوئی فرق نہیں
ہوتا۔'' ۴۳ے

مختار مسعود نے اپنی سوانح نگاری میں جو خاص تنوع برتا ہے وہ ان کے مشاہدے، مشاغل اور حسِ جمالیات کا بھی آہنگ ہے سوانح میں زبان کی چاشنی اور رواں اسلوب ڈاکٹر فضل الرحمان کے سوانحی شہ پارے میں جا بجا قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اس سوانحی رنگ کا ایک انداز دیکھیے:

''فضل الرحمان کے رنگ ڈھنگ اتنے نرالے تھے کہ ابھی انہوں نے دم
بھی نہ لیا تھا کہ ان سے کئی کہانیاں منسوب ہوگئیں۔ دانستہ غلط بیانی کسی
نے نہ کی مگر کردار اور اس کے حالات کو دلچسپ پایا اس لیے اپنی اپنی رائے
اور تجزیہ کو کہانی کا حصہ بنا کر پیش کر دیا۔'' ۴۴ے

''ایک روایت کے مطابق فضل الرحمان دسویں کا امتحان دے کر اس ڈر
کے مارے گھر سے فرار ہوگئے کہ فیل ہو جائیں گے مگر پاس ہو گئے،
دوسری روایت کے مطابق وہ بڑا لڑکا ہونے کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے
لیے تلاشِ معاش کی خاطر گھر سے نکلے تھے، تیسری روایت کے مطابق وہ
گھر سے اس لیے چلے گئے تھے کہ گھر والوں پر ایک فرد کا بوجھ کم ہو
جائے۔ ساری روایتوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کو ختم
ہوئے کوئی دس برس گذر رہے ہوں گے کہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا گجرات
شہر کے شاہدولا دروازے سے نکلا اور براعظم ہند اور بحر ہند کو عبور کرنے
کے بعد افریقی جزیرے زنجبار میں سلطان کے محل کے دروازے پر جا نکلا

۔کشتیاں جلا کر آیا تھا اس لیے محنت مشقت کے لیے تیار اور ہر تکلیف اٹھانے پر آمادہ وہ خوش شکل اور ہنس مکھ تھا، مہم جو اور چاک و چوبند تھا۔محل کی حفاظتی پولیس میں بھرتی ہو گیا اور جلد ہی ترقی پا کر سارجنٹ بن گیا ۔پہلے وردی ملی پھر پیٹی اور پستول ، کچھ عرصے بعد موٹر سائیکل بھی مل گئی۔"۵ے

"فضل الرحمان کی وجہ سے ہمارے گھر میں رونق لگی ہوئی تھی ۔سرے شام بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ، چھڑکاؤ کیے ہوئے کچے صحن میں کرسیوں اور چارپائیوں پر اتنی دیر تک محفل جمتی کہ رات کی رانی کی خوشبو فضل الرحمان کی خوش کلامیوں میں گھل جاتی۔ فضل الرحمان افریقہ کی ملازمت اور یورپ کی سیاحت سے واپس آئے تھے۔ ان کے راہ آورد میں ہر ایک کی دلچسپی کا سامان تھا۔عمر ایسی کہ طلبا سے دس برس بڑے اور اساتذہ سے دس برس چھوٹے تھے بیان ایسا میٹھا کہ چھوٹے اس کی چاشنی میں چپک کر رہ جائیں اور بڑے اس کی گرمی میں ہاتھ تاپنے لگیں۔ سفر کی داستان کا جال اس انداز سے پھینکتے کہ چھوٹی بڑی دونوں طرح کی مچھلیاں اس میں پھنس جاتیں۔"۶ے

"فضل الرحمان کے ہوسٹل چلے جانے اور شب تعارف کی واردات سے پہلے شب برات آگئی وہ بچوں کی طرح مچل گئے۔ بازار میں فٹ پاتھ پر سجے خوانچوں اور ریڑھی پر لگے شبراتی سامان میں سے ڈھیر ساری چیزیں خریدنے کے بعد وہ اڑنے والی روشن قندیلوں ، اور دور مار راکٹوں کی تلاش میں آتش بازوں کے محلّہ میں جانکلے۔ کبھی چرخی فانوس مانگتے اور کبھی فانوس خیال پر تبادلہ خیال شروع کر دیتے۔ جب وہ بازار میں آتش بازی کا

سامان خریدرہے تھے تو ان کی باتوں اور حرکتوں کی وجہ سے جمگھٹا لگ گیا وہ
دکانداروں میں مقابلہ کراتے جس کا مچھر دیر تک پٹپٹائے اور جس کا چکر
دیر تک گھومے اس سے بہت سا سامان خرید لیتے کہتے اس طرح
مصنوعات کا معیار بلند ہوتا ہے۔ سامان کا ٹوکرا تانگہ کے پچھلے پائیدان پر
رکھا تو پیر رکھنے کی جگہ نہ بچی۔ شب برات آئی تو کوئی بوڑھا نہ بچا جس نے
عمر رفتہ کو آواز نہ دی ہو، پٹاخے اور قہقہے، پھلجھڑیاں اور لطیفے، انار اور
شوخیاں۔'' ۷ے

بریگیڈیر اور ادیب صدیق سالک کا شمار مختار مسعود کے دوستوں میں کیا جاتا ہے یہ صدیق
سالک کی سوانحی شخصیت کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

''صدیق سالک کے بارے میں میری رائے ہے کہ بھارت میں جنگی
قیدی کی حیثیت سے اس نے آواگون کے عقیدہ کے مطابق ایک نیا جنم لیا
تھا۔ کڑک بانکا فوجی ایک سادھو سنت بن کر دوبارہ پیدا ہوا یہی وجہ ہے کہ
اس نے سقوط ڈھاکہ کے بارے میں اس انداز سے اپنی ذات کو علیحدہ رکھ
کر لکھا جیسے وہ اس کے پہلے جنم کی باتیں ہوں۔ دوسرے جنم میں وہ کسی
بات یا واقعہ کا زیادہ اثر قبول نہیں کرتا حکومت کی حماقتیں، محلاتی سازشیں،
بین الاقوامی خطرات، وہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا کوئی صورت بھی ایسی
نہیں جو اسے قلبی یا دماغی صدمہ پہنچا سکے۔ وہ صدمہ کی آخری حد کو چھو کر
واپس آیا ہے۔'' ۸ے

مختار مسعود نے اپنے ان ہم جماعتوں کا ذکر بھی سوانحی انداز سے کیا جن کے ساتھ ان کا وقت
بہت مختصر لیکن پُر اثر رہا ان ہی میں احمد شیرازی بھی ہیں:

''احمد شیرازی نام کا ایک گورا چٹا اور بھولا بھالا لڑکا ہمارے اسکول میں

داخل ہوا۔ اس کا قیام انگلش ہاؤس میں تھا اس بورڈنگ ہاؤس میں امیر زادے رہا کرتے تھے۔ میری اس سے کوئی خاص ملاقات نہ تھی اس لیے میں اس کو بھول چکا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد وہ مجھے اچانک کراچی میں ملا۔ خوش وضع اخلاق، دلچسپ مگر قدرے خاموش، پہلی ملاقات ہی کچھ اس انداز سے ہوئی جیسے ہم دونوں پرانے دوست ہیں۔''۹ے

مختار مسعود اپنی سوانح نگاری کو پل صراط سے گزارتے ہیں، شخصیت کتنی ہی قدآور کیوں نہ ہو اس پہ لکھتے ہوئے ان کے قلم نے ہمیشہ حقائق کو مدنظر رکھا اس کا واضح ثبوت خورشید الاسلام کی سوانح میں ملاحظہ کیجیے:

''لندن میں ایک دن سرِ راہ میری ملاقات خورشید الاسلام سے ہوگئی۔ چند سال قبل خورشید بھائی مسلم یونی ورسٹی کے سرکردہ اور شعبہ اردو کے ممتاز طالبِ علم شمار ہوتے تھے۔ لائق فائق، متین اور خوش اخلاق، تحریر اور تقریر دونوں میں طاق، یونی ورسٹی میں سب ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ ان کے مستقبل کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کرتے، تان اس پر توڑی جاتی کہ طرزِ تحریر اور اسلوبِ نگارش میں وہ کمال حاصل کریں گے کہ اردو ان پر ناز کرے گی۔ ایک دن باہر کے ایک معتبر شخص نے اس صاحبِ جوہر کے لیے اپنے خط میں دو جملے ایسے لکھے کہ سب رشک اور حیرت کا شکار ہو گئے یونی ورسٹی میگزین میں اس خط کی اشاعت کے بعد معاصرین نے انہیں ہمیشہ بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا اور ان سے بڑی توقعات وابستہ کرلیں، خورشید الاسلام نے ایم اے اردو کی سند کے لیے شبلی نعمانی پر طویل تنقیدی مقالہ لکھا تھا وہ یونی ورسٹی میگزین میں شائع ہوا۔ ہندوستان کے وزیرِ تعلیم نے وہ مقالہ پڑھا اور بے حد متاثر ہوئے، رشید احمد صدیقی

کے نام خط لکھا اور دریافت کیا کہ یہ خورشید الاسلام نامی شخص کون ہے، جس نے اتنا اچھا مضمون لکھا ہے۔ خورشید الاسلام کی انشا پردازی کی بے اختیار تعریف کرنے والے وزیر تعلیم کا نام مولانا ابوالکلام آزاد تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے علی گڑھ کو ایک نیا عبدالرحمٰن بجنوری مل گیا ہے، اس کے نام کا ڈنکا بجے گا علی گڑھ سرخرو ہوگا۔'' ۸۰

''آکسفورڈ اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر کھڑا اگر ماگرم'' کاجو'' خرید رہا تھا کہ سامنے سے خورشید الاسلام آتے ہوئے نظر آئے کئی سال کے بعد ان کے یوں اچانک ملنے پر جی بہت خوش ہوا۔ انہوں نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور اپنے آپ کو دوسرے طریقوں سے گرم رکھنے کا بھی پورا پورا انتظام کیا ہوا تھا۔ رسمی سوال جواب کے بعد میں نے سب سے پہلے اس خدشے کا اظہار رضا کارانہ اور بن مانگے مشورے کے طور پر کیا کہ تحقیق وتنقید کے لیے لندن کی موزونیت کہیں ان کی تخلیقی تحریر اور انشاء کے جوہر پر غالب نہ آجائے، پھر فرطِ شوق سے دریافت کیا کہ ابوالکلام کے توصیفی خط کے بعد وہ کتنے مقالے، مضامین اور کتابیں لکھ چکے ہیں کیا کچھ لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' ۸۱

فرمانے لگے:

''میں آج کل ایک اہم کام میں مصروف ہوں، انگریزوں کے لیے اردو کا قاعدہ لکھ رہا ہوں میں نوجوان تھا، حساس تھا یہ بات سن کر میرا دل بجھ گیا خورشید صاحب سے اس کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔'' ۸۲

''ایک انگریز مستشرق سے یہ سوال کیا کہ خورشید الاسلام طرز اور صاحب اسلوب ادیب کی حیثیت سے اس مقام تک کیوں نہ پہنچ سکے جو مولانا آزاد

کے خط کی روشنی میں ان کا حق بنتا تھا۔ جواب ملا انشاء اور آسائش کا مقابلہ تھا، آسائش انشاء پر غالب آئی خورشید کا تعلق تن آسانوں کے قبیلے سے ہے یہ لوگ جسم وجاں کو کسی مشکل میں ڈالنے کے قائل نہیں، پتا ماری اور عمر بھر مسلسل محنت ان کے بس کی بات نہیں۔'' ۸۳؎

مختار مسعود میں سوانح نگاری کی ایک خوبی تجزیہ اور تقابل کی وہ خداداد صلاحیت ہے جو مولانا محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کے سوانحی شہ پارے میں واضح ہے:

''ابوالکلام آزاد کے قلم برداشتہ لکھتے رفتارِ قلم تیز ہوتی اور رفتارِ فکر تیز تر، ''الہلال'' کے زمانے میں بسا اوقات یہ حالت ہوتی کہ ایک صفحہ پورا ہوا تو اسے کمپوز کرنے کے لیے بھیج دیتے اور دوسرا لکھنا شروع کر دیتے۔'' ۸۴؎

''مولانا اپنی ادبی تحریر بھی اسی انداز سے لکھتے تھے۔ ان کی طرف سے اور ان کی مرضی کے بغیر جواب دیا جاسکتا ہے کہ لکھنے کی رفتار تیز ہوتی مگر صحافتی تحریر کے مقابلہ میں بہت سست، ادبی تحریر کو نظر ثانی کے بغیر شائع کرنے کے قائل نہ تھے۔ وقت میسر آنے پر دو چار بار نگاہ ڈال لیتے۔'' ۸۵؎

''نصف شب کے سکوت اور سکون کا منتظر رہتا، تہجد ادا کرتا اور قلم کاغذ لے کر فرش پر بیٹھ جاتا گاؤ تکیہ سے ٹیک لگاتا، لیمپ، کشمیری گلدان اور تھال سامنے رکھ لیتا، تھال میں پنسل اور چھالیہ ہوتی، یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی تھال ہٹا دیا جاتا، قلم دان بند کر دیا جاتا ،کاغذ سمیٹ لیے جاتے، نماز کے بعد صاحب موصوف باغ کی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔'' ۸۶؎

''محمد حسین آزاد عبارت کو بار بار لکھتے اور بار بار کاٹتے، صفحہ کے جس حصے میں متواتر کاٹ چھانٹ کی وجہ سے نئے الفاظ کی نشست اور پرانے الفاظ

کی برخاست گڈمڈ ہو جاتی وہاں چیپی لگا دیتے پھر کاغذ کے اس ذرا سے ٹکڑے کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو پورے کاغذ کے ساتھ کیا جاتا، چیپی پر چیپی لگتی یہاں تک کہ مسودے کے بعض اوراق پر گتے کا گماں گزرتا۔''۸۷

''چار بجے صبح کا جاں فزا وقت، مہارت سے دم دیا ہوا یاسمینی خوشبوں والا چینی قہوہ، عام پیالیوں سے کہیں چھوٹا روسی فنجان۔ قہوہ دانی اور فنجان میز پر دائیں جانب رکھتے اور قلم و کاغذ بائیں جانب۔ ٹھہر ٹھہر کر قہوے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے اور عالم سرشاری میں قلم برداشتہ لکھتے رہتے، گھنٹہ بھر کے بعد قہوہ کی تیسری پیالی کے ختم ہوتے ہی میز کرسی چھوڑ کر اٹھ کر کھڑے ہوتے۔''۸۸

مختار مسعود کی سوانحِ نگاری میں تجزیے کا ایک اور رنگ مہدی افادی، سعادت حسن منٹو، راشد الخیری، ابوالفضل صدیقی اور جمیلہ ہاشمی کی سوانح میں اس طرح ہے:

''مہدی افادی نازک مزاج اور نفاست پسند تھے۔ انھیں لکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے، کاغذ اعلیٰ درجے کا، قلم نیا، سیاہی خاص الخاص، اس کے بعد وہ موسم سہانا ہونے کی شرط لگا دیتے اس مطالبے کے پورا ہونے کے بعد بھی انتظار رہتا کہ کب من کی موج اٹھے، طبیعت میں ترنگ آئے اور وہ لکھنا شروع کریں۔''۸۹

''سعادت حسن منٹو ایک ہی نشست میں افسانہ لکھنے کے قائل تھے۔ انہماک کا یہ عالم ہوتا کہ بھرے گھر کے شور وغل اور آمد و رفت سے بے نیاز بیٹھے لکھتے رہتے، پارکر اور سفیر کے بہت قلم خریدے لیکن لکھنے کے لیے ٹائپ رائٹر استعمال کرتے اس مشین کی کھٹ کھٹ سے وہی کام لیتے جو

غالب نے صریرِ خامہ سے لیا تھا۔ نوائے سروش کو رقم کرنے کے بعد نظرِ ثانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"۹۰

"راشد الخیری نے بہت لکھا، پڑھنے والے کو گمان گزرتا ہے جیسے انہوں نے جم کر لکھا ہو۔ کوچۂ چیلاں میں ان کے ہم سایے ہوا کرتے تھے جو کہ آزادی کے بعد کراچی کے علاقہ نارتھ ناظم آباد میں آباد ہو گئے۔ ان سے ایک بار راشد الخیری کا ذکر ہوا کہنے لگے، مصنف کی حیثیت سے خیری ایک مضطرب روح کا نام تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد کاغذ قلم رکھ دیتے اور اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتے گاہے بے اختیار اٹھ کھڑے ہوتے، گھر سے نکل کر بازار میں آجاتے چند منٹ بے مقصد گھومنے کے بعد تازہ دم ہو کر پھر لکھنے کے لیے بیٹھ جاتے۔ ان کے یہاں مدت اور تعداد کے اعتبار سے لکھنے کا عرصہ اور نہ لکھنے کا وقفہ دونوں برابر ہوتے۔"۹۱

"ابوالفضل صدیقی میرے کرم فرما تھے۔ رات کی خاموشی میں پلنگ پر بیٹھ کر اعلیٰ باریک کاغذ پر فاؤنٹین پن سے لکھا کرتے۔ گاہے نیلے رنگ کے پیڈ کا وہ پتلا کاغذ استعمال کرتے جو ہوائی ڈاک کے کام آتا ہے۔ کم وزن اور پائیدار پرت۔ خط ان کی اپنی ایجاد تھی۔ خفی، شکستہ اور طغرائی۔ خوش خط ہونے کے باوجود ان کے لکھے ہوئے کا پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کا صندقچی نما قلم دان پرانی طرز کا تھا۔ اس میں طرح طرح کے فاؤنٹین پن اور دو تین طرح کی دواتیں رکھی ہوتیں تھیں۔ ان کے پاس بلا مبالغہ تیس چالیس قلم ہوں گے۔"۹۲

"جمیلہ ہاشمی مہینوں مواد جمع کرتی اور نوٹ بناتی رہتی اور پھر یکا یک لکھنے کا

دورہ پڑتا دن رات ایک کر دیتیں، کھانے پینے کا شوق رہتا نہ منہ دھونے اور کنگھی چھوٹی کا، شوہر کا نہ بیٹی کا۔ افسانہ، ناولٹ یا ناول کی تکمیل کے بعد وہ ہنس ہنس کر اپنی بے رخی کی تلافی کرتیں۔ ضرورت پڑنے پر معافی مانگ لیتیں۔"۹۳

مختار مسعود اپنے ممدوح کی کسی وصف کو اس کی سوانح میں جس خوب صورتی سے بیان کرتے، اس کا دلنشین انداز قاری کے دل میں گھر کرتا ہے۔ ملا واحدی کے خوبیِ قلم کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ملا واحدی کے تین امتیازات ہیں، عبارت، ادارت اور رفاقت۔ ان کی عبارت میں ستر برس کی مشق اور مہارت شامل ہے ادارت کا یہ حال ہے کہ ایک وقت وہ اکھٹے نو رسائل کے مدیر اور مہتمم تھے۔"۹۴

"جہاں تک رفاقت کا تعلق ہے اس کے دو دعویدار ہیں، شہروں میں دلّی اور انسانوں میں خواجہ حسن نظامی، ایک واحدی صاحب کا ساتھ چھوڑ گئے اور دوسرے کو واحدی صاحب نے خود چھوڑ دیا۔"۹۵

"آزادی سے پہلے ملا واحدی کا نام سن رکھا تھا۔ یہ نام اتنا انوکھا لگا کہ وجہ تسمیہ پوچھنی پڑی۔ معلوم ہوا یہ نام نہیں لقب ہے۔ پیر و مرشد کے عطا کیے ہوئے لقب کی شہرت نے وہ گرد اٹھائی کہ سید محمد ارتضےٰ کا اصل نام اس غبار میں گم ہو گیا۔"۹۶

"خواجہ حسن نظامی نے انہیں کبھی مد مقابل نہ سمجھا اور ملا واحدی نے انہیں کبھی روایتی پیر نہ مانا۔"۹۷

"واحدی صاحب اپنی تحریروں میں نمایاں رہتے ہیں ان کی تحریر ایک طرزِ نگارش سے زیادہ ایک طرزِ حیات سے عبارت ہے۔"۹۸

''بڑے سے بڑا نکتہ ہو یا نازک سے نازک مقام، اس عبارت کی سادگی میں فرق نہیں آتا، اور معنی آفرینی کا حق بھی پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔''۹۹

''وہ ایک لفظ، ایک اشارے یا ایک ایک سطر میں ایک پوری داستان سمو کر آگے بڑھ جاتے ہیں، ان کی مختصر نویسی کا یہ کمال ہے کہ ہر منظر مکمل لگتا ہے، اور بات مفصل معلوم ہوتی ہے، تاثرات کی ابتدا کسی معمولی بات سے ہوتی ہے جو آخر تک پہنچتے ہی غیر معمولی بن جاتی ہے۔ پڑھنے والا چونک اٹھتا ہے کہ غیر اہم اور اہم کا درمیانی سفر اتنا مختصر کیسے ہو گیا۔''۱۰۰

''ملا صاحب (واحدی) کے یہاں شیریں بیانی ملتی ہے اور پیار سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے،''۱۰۱

''واحدی صاحب کی زندگی میں کوئی تصنع نہیں، جو سوچتے ہیں وہی کہتے اور لکھتے ہیں اور اسی پر عمل بھی کرتے ہیں۔ وضع داری کا یہ عالم ہے کہ پچاسی برس کی عمر اور فالج کے باوجود ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ووٹ ڈالنے گئے۔''۱۰۲

''واحدی صاحب نے شادیاں تین کیں مگر عشق صرف دلّی سے کیا۔''۱۰۳

''واحدی صاحب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی۔ مطالعہ اور مشاہدہ ایک طرف حافظہ اور بیان دوسری طرف سننے والا کبھی اس پر حیران ہوتا ہے اور کبھی اُس پر۔ نہ حیرت ختم ہوتی ہے اور نہ بات ختم ہونے میں آتی ہے۔ بیان کا انداز یہ ہے کہ وہ بات کا ایک سرا لے کر دائرہ بناتے ہیں پھر دوسرا سرا اس دائرے سے گذار کر گرہ لگاتے ہیں سننے والا بھی بات گرہ میں باندھ لیتا ہے۔''۱۰۴

''نوائے وقت میں جب ''تاثرات'' کے عنوان سے واحدی صاحب کا
کالم چھپنے لگا تو پہلا کالم پڑھتے ہی دل مچل گیا اور واحدی صاحب کو جاننے
اور ان سے ملنے کی خواہش بھی پیدا ہوگئی۔'' ۱۰۵

''واحدی صاحب کو جب میں نے آٹو گراف البم پیش کی تو انہوں نے
ورق پلٹ کر چند دستخط دیکھے۔'' ۱۰۶

''واحدی صاحب نے اپنے دستخط کیے اور یہ نصیحت لکھی۔ بولنے لکھنے اور
ہر کام کرنے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس سے دین یا دنیا کا کوئی فائدہ
ہوگا یا نہیں۔'' ۱۰۷

''واحدی صاحب کا شجرہ یاد آ گیا، کہتے ہیں کہ نادر شاہ ہاتھی سے اس لیے
اتر گیا کہ اس کی لگام نہیں ہوتی اور شاہ جہاں کو ہاتھی پر چڑھنے میں یوں
تامل ہوا کہ شاہ کی طرف فیل بان کی پشت ہوتی ہے۔'' ۱۰۸

''ملا واحدی آخری فوجدار خاں کی لڑکی کے پڑپوتے ہیں ہاتھی چلتا تو بادشاہ
کی نظر آگے پڑتی اور پیش نشیں کی نظریں پیچھے لگی رہتیں۔'' ۱۰۹

''واحدی صاحب کو ماضی کی طرف منہ کر کے دیکھنے اور لکھنے کی عادت شاید
ورثے میں ملی ہے۔'' ۱۱۰

مختار مسعود نے اپنی سوانح نگاری میں پاکستانی سیاست کی غلام گردشوں پہ اہل قلم کی بے قدری پر بلا خوف لیکن افسردگی سے لکھا ڈاکٹر سید زوار زیدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر زوار کی نصف صدی کی لگن، محنت اور تگ ودو کی بدولت آل انڈیا
مسلم لیگ کا ریکارڈ اور قائداعظم محمد علی جناح کے کاغذات نا اہل جانشینوں
اور ناشناس نسلوں کے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچ گئے۔ قائدِ اعظم کے
کاغذات کو مرتب کرنے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہوا اور وہ بیس برس تک

بغیر تنخواہ کے یہ کام کرتے رہے۔ حکومت کی طرف سے انہیں رہائش کی سہولت میسر تھی مگر جس طرح انہیں اس سرکاری گھر سے بے دخل کیا گیا وہ ایک عمر رسیدہ حساس اور شریف النفس اسکالر کی جان لینے سے کم نہ تھا، وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکے۔ ملک کی داغدار تاریخ میں ایک داغ کا اور اضافہ ہو گیا وہ جنھیں اقتدار اس لیے دیا جاتا ہے کہ حق دار کو حق اور واجب التعظیم کو عزت ملے ان کی بلا جانے کہ ڈاکٹر زوار نے کن حالات میں انتقال کیا۔'' [۱]

''مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی دستاویزات کو قومی ورثہ کے طور پر محفوظ کرنے کا فیصلہ اور اس پر عمل در آمد کئی لوگوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ قوم ان سب کی مرہون منت ہے ایک شخص البتہ ان تمام لوگوں میں سب سے ممتاز ہے اور اس کا نام ڈاکٹر سید زوار زیدی ہے، وہی بے لوث شخص جو بیماری اور ناقدری کے باوجود سالہا سال تک اسی کام میں لگا رہا وہ ایف اے اور بی اے میں میرے ہم جماعت اور ایم اے میں میرے ہم عصر تھے۔'' [۲]

مختار مسعود، سچے عاشقِ رسول داعی ختم نبوت تحریکِ آزادی کے شعلہ بیاں رہنما بے باک صحافی اور مجلس احرار کے بانی جناب سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری کی سوانحی خوبی کو خوب صورتی سے لکھتے ہیں:

''وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے اور اس انجمن کا نام مجلس احرار تھا۔'' [۳]

''شاہ جی کی تقریروں کا بڑا چرچا تھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ عشاء سے فجر ہو جاتی مگر طبیعت سیر نہ ہوتی، خوش الحان اور خوش بیان تھے، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی محاورے پر قادر تھے۔ قرات، نثر، نظم، لطیفہ، ہجو اور

تشنیع کو حسب ضرورت استعمال کرتے تھے۔''۱۱۴

''شاہ جی اپنے زمانے کے سب سے معروف مقرر تھے۔عوام نے انہیں سر آنکھوں پر رکھا اور خواص نے ان سے ہمیشہ خم کھایا۔''۱۱۵

''اردو نے جب بھی اپنے سرمایۂ افتخار پر ناز کیا تو اسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے ان میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری بھی شامل ہونگے۔''۱۱۶

مختار مسعود کی شدید خواہش اور اصرار پر منشی عبدالرحمان خاں نے اس ملاقات کے اہتمام کا بندوبست کروایا اس زمانے میں مختار مسعود ڈپٹی کمشنر ملتان تھے:

''شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی یہ ملاقات منشی عبدالرحمان خاں کے ذمہ تھی انہوں نے شاہ جی سے بات کی تو وہ ٹال گئے کہنے لگے کہ میں ساری عمر انتظامیہ سے لڑتا آیا ہوں ڈپٹی کمشنر اگر بلانا چاہے تو وارنٹ گرفتاری نکالے۔''۱۱۷

''عطاءاللہ شاہ بخاری میرے یہاں مہمان بن کر تشریف لے آئے۔ میں نے موٹر کار کا دروازہ کھولا، پہلے ایک پھڑکتا ہوا فارسی شعر برآمد ہوا اور اس کے پیچھے شعر پڑھنے والا اترا۔ڈھیلا ڈھالا کھدر کا کرتا سبز چارخانہ تہ بند، دیسی جوتی، دراز قد اور دراز ریش، کشادہ جبیں اور خندہ رو۔''۱۱۸

''میں نے شاہ جی سے اپنے اشتیاق کا قصہ بیان کیا۔ان کی تقریر کبھی نہیں سنی مگر اس کی تعریف اتنی سنی ہے کہ زبانِ خلق پر ایمان لے آیا ہوں۔''۱۱۹

''شاہ جی نے آیات، احادیث، اشعار اور چٹکلوں سے ایک جادو جگائے رکھا۔ میں ان کی خطابت کا راز جاننا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ موضوع اتنی تیزی سے بدلتے رہے کہ خطابت پر جم کر بات نہ ہو سکی۔ گفتگو شاہ جی کی صحت سے شروع ہوئی اور توکل سے ہوتی ہوئی

سیرت تک پہنچی، وہاں سے تاریخ کا ذکر آ گیا اور اس میں مختلف تحریکیں شامل ہو گئیں۔'' [120]

مختار مسعود اپنے ہم جامعہ ڈاکٹر نسیم انصاری کی سوانح قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میں آپ کو آج بھی بالکل اسی حالت میں پاتا ہوں اور اسی صورت میں دیکھتا ہوں جیسا کہ آپ اپنی زندگی میں ہوا کرتے تھے۔ فرنگی محلی، علیگ، کمیونسٹ، ترقی پسند مصنف، Activist (سرگرم عمل)، سخن شناس، خوش کلام، شہ سوار، غزالی کو عالم اسلام کے جدید علوم سے روگردانی کا ذمہ دار ٹھہرانے والا، مسائل تصوف کو خالہ جی کا گھر سمجھنے والا اور عمر بھر کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے والا۔'' [121]

''میں جس مکتوب الیہ سے مخاطب ہوں اس کی آن بان اور طرحداری ''جواب دوست'' کے ہر لفظ اور ہر سطر سے جھلکتی ہے۔ میں اگر اس خط کے آخری حصے میں ''جوابِ دوست'' کے ایک آدھ واقعہ کو نادرست قرار دوں تو اس کی وجہ وہ ترنگ ہے جس میں آپ نے اسے لکھا ہے۔ آپ ایک ذہین اور پہلو دار شخص ہیں لہذ آپ کی انا بھی عام درجہ کی صلاحیت رکھنے والے طلبہ اور اساتذہ سے کہیں زیادہ خود پسند ہے۔'' [122]

مختار مسعود کی سوانح نگاری کے فنی محاسن کے مطالعے کے بعد یہ بات انتہائی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی تمام پر خلوص تحریریں ایک مخلص سوچ، وسیع تجربے، عمیق مشاہدے، گہرے مطالعے اور توانا ذہن کی پوری زندگی کی محنت و ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان میں ایک ذہین سماجی تجزیہ نگار اور شعر و ادب کا شیدائی جا بجا ابھرتا ہے انھوں نے کچھ جملے لکھ کر بھی کئی شخصیات کی سوانح کو قرطاس پر منتقل کیا جن میں سر فیروز خاں نون، شیخ محمد اکرام، ابوالفضل صدیقی، سیّد راس مسعود، آغا اشرف، احسان الحق، عبدالرحمٰن صدیقی، صدیق احمد صدیق، اختر الایمان، سید حسین،

اور شاکر حسین شامل ہیں۔ انہوں نے ''آوازِ دوست''، ''سفر نصیب''، ''لوحِ ایام'' اور ''حرفِ شوق'' میں سوانح نگاری کے فنی محاسن کو تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے، سوانح کو قصیدہ نہیں بنایا بلکہ غیر جانبداری کی راہیں روشن کرنے کے ساتھ ہی ماضی کی تہذیبی، ثقافتی، ادبی رجحانات اور روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلوبِ نگارش کی دلکشی اور انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ ناصح بننے کے بجائے مراتب کو ملحوظ رکھا ہے، اختلاف رائے کو ذاتی اختلاف میں نہیں بدلا، یہ ان کی کامیاب شعوری کوشش اور سوانح نگاری کی کامیابی ہے۔

☆☆
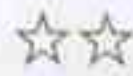
حواشی

۱۔ ڈاکٹر حسن وقار گل، اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد، ص ۲۴

۲۔ 'سیرت فریدیہ'، سرسید احمد خاں نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین کے بارے میں لکھی۔

۳۔ ڈاکٹر سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری، ص ۲۵۳

۴۔ ڈاکٹر مظہر مہدی، بیسویں صدی میں اردو سوانحی ادب، مشمولہ: بیسویں صدی میں اردو ادب، (مرتب) گوپی چند نارنگ، ۳۳۶

۵۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ۸۴

۶۔ محولہ بالا، ص ۱۰۳

۷۔ محولہ بالا، ص ۱۱۲

۸۔ محولہ بالا، ص ۱۴۳

۹۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، ص ۲۰

۱۰۔ محولہ بالا، ص ۳۶۷۔۳۶۸

۱۱۔ محولہ بالا، ص ۳۹۳

۱۲۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۱۳

۱۳۔ محولہ بالا، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۱۴۔ ایک چینی مسلمان عالم (جس سے انہوں نے پہلا آٹوگراف لیا تھا)

۱۵۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۵۲

۱۶۔ مختار مسعود، سفر نصیب، ص ۲۹۸

۱۷۔ محولہ بالا، ص ۳۰۴

۱۸۔ محولہ بالا، ص ۳۱۲۔۳۱۳

۱۹۔ محولہ بالا، ص ۳۱۳۔۳۱۴

۲۰۔ محولہ بالا، ص ۳۱۵

۲۱۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۲۲۸

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ محولہ بالا، ص ۲۳۰

۲۴۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۱۲۴

۲۵۔ محولہ بالا، ص ۱۱۹

۲۶۔ محولہ بالا، ص ۱۱۸۔۱۱۹

۲۷۔ ظفر حسین ظفر، 'حرفِ شوق' از مختار مسعود، مشمولہ: ششماہی 'ثبات'، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۱۸ء، ص ۲۵۷۔۲۵۸

۲۸۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۸۳

۲۹۔ محولہ بالا، ص ۸۷۔۸۸

۳۰۔ محولہ بالا، ص ۸۸

۳۱۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، ص ۱۱۹

۳۲۔ محولہ بالا، ص ۱۱۸۔۱۱۹

۳۳۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۲۳۸

۳۴۔ محولہ بالا، ص ۲۴۲۔۲۴۳

۳۵۔ محولہ بالا، ص ۸۸

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ محولہ بالا، ص ۸۳

۳۸۔ محولہ بالا، ص ۱۶۲

۳۹۔ محولہ بالا، ص ۱۶۳

۴۰۔ محولہ بالا، ص ۱۶۲

۴۱۔ محولہ بالا، ص ۱۵۹۔۱۶۰

۴۲۔ محولہ بالا، ص ۹۴

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ محولہ بالا، ص ۱۰۳

۴۵۔ محولہ بالا، ص ۹۴۔۹۵

۴۶۔ محولہ بالا، ص ۱۸۰

۴۷۔ محولہ بالا، ص ۱۸۰۔۱۸۱

۴۸۔ محولہ بالا، ص ۱۹۰

۴۹۔ محولہ بالا، ص ۱۹۱

۵۰۔ محولہ بالا، ص ۲۰۰

۵۱۔ محولہ بالا، ص ۲۰۱

۵۲۔ محولہ بالا، ص ۲۰۰

۵۳۔ محولہ بالا، ص ۱۴۳

۵۴۔ محولہ بالا، ص ۱۴۳۔۱۴۴

۵۵۔ محولہ بالا، ص ۱۳۷

۵۶۔ محولہ بالا، ص ۱۴۲۔۱۴۳

۵۷۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۴۲۴

۵۸۔ محولہ بالا، ص ۴۱۸۔۴۱۹

۵۹۔ محولہ بالا، ص ۴۱۳

۶۰۔ مختار مسعود، سفر نصیب، ص ۱۳۳

۶۱۔ محولہ بالا، ص ۱۳۴

۶۲۔ محولہ بالا، ص ۱۳۸

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ محولہ بالا، ص ۱۳۸۔۱۳۹

۶۵۔ محولہ بالا، ص ۱۴۶

۶۶۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۲۷۵۔۲۷۶

۶۷۔ محولہ بالا، ص ۲۷۸

۶۸۔ ظفر حسین ظفر، 'حرفِ شوق' از مختار مسعود، ص ۲۵۸۔۲۵۹

۶۹۔ محولہ بالا، ص ۳۰۷

۷۰۔ محولہ بالا، ص ۲۵۷

۷۱۔ ظفر حسین ظفر، 'حرفِ شوق' از مختار مسعود، ص ۲۵۹۔۲۶۰

۷۲۔ محولہ بالا، ص ۵۵

۷۳۔ محولہ بالا، ص ۲۵۴

۷۴۔ مختار مسعود، سفر نصیب، ص ۲۹۶۔۲۹۷

۷۵۔ محولہ بالا، ص ۲۹۷

۷۶۔ محولہ بالا، ص ۲۹۹

۷۷۔ محولہ بالا، ص ۳۰۹۔۳۱۰

۷۸۔ مختار مسعود، لوح ایام، ص ۱۴۴

۷۹۔ محولہ بالا، ص ۵۶

۸۰۔ مختار مسعود، حرف شوق، ص ۴۳۸۔۴۳۹

۸۱۔ محولہ بالا، ص ۴۳۹

۸۲۔ ایضاً

۸۳۔ ایضاً

۸۴۔ محولہ بالا، ص ۴۲۵

۸۵۔ ایضاً

۸۶۔ محولہ بالا، ص ۴۲۵۔۴۲۶

۸۷۔ محولہ بالا، ص ۴۲۵

۸۸۔ محولہ بالا، ص ۴۲۶

۸۹۔ محولہ بالا، ص ۴۲۷

۹۰۔ محولہ بالا، ص ۴۲۷۔۴۲۸

۹۱۔ محولہ بالا، ص ۴۲۸

۹۲۔ محولہ بالا،ص ۴۲۶

۹۳۔ محولہ بالا،ص ۴۲۷

۹۴۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۱۰۴

۹۵۔ ایضاً

۹۶۔ ایضاً

۹۷۔ محولہ بالا،ص ۱۰۴۔۱۰۵

۹۸۔ محولہ بالا،ص ۱۰۵

۹۹۔ ایضاً

۱۰۰۔ محولہ بالا،ص ۱۰۶

۱۰۱۔ محولہ بالا،ص ۱۰۷

۱۰۲۔ محولہ بالا،ص ۱۰۹

۱۰۳۔ ایضاً

۱۰۴۔ محولہ بالا،ص ۱۱۰

۱۰۵۔ محولہ بالا،ص ۱۰۵

۱۰۶۔ محولہ بالا،ص ۱۱۸

۱۰۷۔ ایضاً

۱۰۸۔ محولہ بالا،ص ۱۱۷

۱۰۹۔ محولہ بالا،ص ۱۱۸

۱۱۰۔ ایضاً

۱۱۱۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۲۰۹۔۲۱۰

۱۱۲۔ محولہ بالا،ص ۲۱۰۔۲۱۱

۱۱۳۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۱۴۷

۱۱۴۔ محولہ بالا،ص ۱۴۸

۱۱۵۔ محولہ بالا،ص ۱۴۸۔۱۴۹

۱۱۶۔ محولہ بالا،ص ۱۴۸۔۱۴۹

۱۱۷۔ محولہ بالا،ص ۱۵۰

۱۱۸۔ محولہ بالا،ص ۱۵۱

۱۱۹۔ ایضاً

۱۲۰۔ محولہ بالا،ص ۱۵۲

۱۲۱۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۵۱۶

۱۲۲۔ محولہ بالا،ص ۵۱۶۔۵۱۷

☆☆

سوانح نگار مختار مسعود ۔۔۔۔۔ تنقیدی جائزہ

اردو کے سوانحی ادب میں سوانح نگاری، آپ بیتی، یاداشتوں اور خودنوشت کو اس لحاظ سے اعتبار حاصل ہے کہ لکھنے والا کہیں متعصب راوی ہوتا ہے تو کہیں خود مورخ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں خود نوشت کی مقدار سوانح عمری کی نسبت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ محاسبہ ذات ایک مشکل مرحلہ ہے جب کہ کسی کی سوانح عمری میں اس کی شخصیت کی جزئیات تک کو محدب عدسے سے دیکھنا انتہائی آسان ہے۔ اس لیے سوانح نگار سے توقع ہوتی ہے کہ وہ واقعات عادات حوادث کو قرطاس کی امانت جانے۔ اردو کے دورِ جدید میں سوانح ادب کے حوالے سے جن قلم کاروں نے لفظ کی حرمت کا پاس رکھا ان میں مختار مسعود صفِ اوّل میں شامل ہیں۔

مختار مسعود اردو ادب کے ایک ایسے فنکار ہیں جن کے نثری تجربات سے اردو ادب میں ہیت اور اسلوب کی نئی راہیں وا ہوئیں، انہوں نے جب ''حرفِ شوق'' ضبطِ قلم کی تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ''حرفِ شوق'' سوانح عمری کا ایک خوب صورت شہ پارہ ثابت ہوگی، اگر چہ ''آوازِ دوست'' اور ''سفرِ نصیب'' میں تحریر کردہ خاکوں میں وہ اجزا موجود ہیں جن کی بنا پر ان کو ہیت کے اعتبار سے صنفِ سوانح عمری میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مختار مسعود وسیع المطالعہ و مشاہدہ شخص تھے۔ انہوں نے شعوری طور پر ہیت کے اعتبار سے مخصوص صنف میں طبع آزمائی کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا نثری اسلوب، زبان و بیان کی گرفت اور لفظوں کی معنی گری ان کی تخلیق کو ایک صنف میں قید نہیں ہونے دیتی، یہی وجہ ہے کہ ''آوازِ دوست''، ''سفرِ نصیب'' اور ''حرفِ شوق'' کے شہ پاروں کو آپ بیتی، خاکے، یادداشتیں، سوانح عمری یا ''لوحِ ایام'' کو خودنوشت یا سفر نامے کی صنف میں شمار کیجیے۔ ہیت اور اسلوب کے اعتبار سے آپ جس صنف میں پرکھیں گے وہ

شہ پارہ اسی صنف کا حصہ معلوم ہوگا۔

مختار مسعود بنیادی طور پر نثر کے تخلیق کار ہیں۔ وہ اپنی سوانح نگاری میں شخصیات کو گہرائی اور گیرائی سے دیکھتے ہیں۔ ان کا مقصد سوانح عمری کی کوئی ایسی جز تلاش کرنا ہوتا ہے جس سے اس کی شخصیت کے خدوخال روشن ہوسکیں۔ وہ اپنے سوانحی شہ پاروں کی جزئیات کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ مبالغہ کا شائبہ نہ رہے۔ اس ضمن میں ان کا کردار ابھارنے کی صلاحیت کو اہمیت دی جاسکتی ہے جس سے کردار ابھر کر سامنے آتا ہے، نواب بھوپال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آخری ایام میں نواب بھوپال دنیائے اسلام کی کوئی نمایاں خدمت نہ کرسکے مگر نیت کا اجر انہیں ضرور ملے گا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کہتے ہیں کہ انہیں اس بات کا اجر بھی ملے گا کہ وہ اس جنت کی تلاش میں جو ماں کے پاؤں تلے ہوتی ہے اپنی والدہ کی قبر کی پائنتی میں دفن ہوئے ہیں۔"[1]

مختار مسعود کی سوانح نگاری میں اسلوب کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ وہ محاورات کا برمحل استعمال، عربی و فارسی کے عمدہ الفاظ کو نگینوں کی طرح مرصع کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح میں انشاپردازی کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے پاس معلومات کا وسیع خزانہ تھا جس کی وجہ سے ان کے قلم میں ہمیشہ روانی رہی۔ ان کے پاس موضوعات کا واضح شعور پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح نگاری محض خانہ پری نہیں بلکہ ان کی تمام سوانح زبان و بیان کے لحاظ سے عمدہ اور ان میں مختار مسعود کے وسیع مطالعے اور مشاہدے کا نکھار پایا جاتا ہے۔ ان کے شہ پاروں میں الفاظوں کا چناؤ جس خوب صورتی سے برتا گیا ہے اس کے بارے میں رئیس امروہوی لکھتے ہیں:

"مختار مسعود کی نثر میں محمد حسین آزاد کی برجستگی، لطیف ظرافت، شگفتہ بیانی اور ابوالکلام آزاد کی بلاغتِ تحریر، شکوہِ بیان اور صداقتِ فکر پائی جاتی

ہے۔ ان کی تحریر میں ایک ایسا نغمہ ہے جو صرف کلاسیکی شاعری میں ملتا ہے۔"[۲]

مختار مسعود بے مثل سوانح نگار و ادیب ہیں انہوں نے اپنے ممدوحین کی شخصیت کو ادب کی کسوٹی پر پرکھ کر انہیں الفاظوں کے پیرہن سے مزین کیا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا جو اپنی مثال آپ ہیں۔ ان سوانحی شہ پاروں میں عقیدت و محبت اور خلوص کا جذبہ کارفرما ہے جس کی بدولت مختار مسعود کا شمار اردو کی قدآور شخصیات میں ہوتا ہے وہ کبھی اپنے ہم عصر لوگوں کے ساتھ مقابلے کی دوڑ میں شامل نہیں ہوئے، بلکہ اپنے لیے ایک الگ راہ کا تعین کیا اور ہمیشہ اس پر گامزن رہ کر اپنے آپ کو اعلیٰ درجے کا ادیب و سوانح نگار منوایا، سوانح نگاری ادب کی وہ صنف ہے جس کے ذریعے سوانح نگار کسی شخص کے کردار میں موجود حسن و قبح کو ابھارتا ہے۔ فنی اعتبار سے مکمل سوانح عمری نا صرف شخصیت کی بلکہ سوانح نگار کے فن کی بھی بھرپور عکاسی کرتی ہے، مختار مسعود قائدِ اعظم کی سوانح میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "قائدِ اعظم کھانا بہت کم کھاتے تھے، دبلے پتلے بوڑھے اور بیمار تھے۔ مرض الموت میں جسمانی کمزوری بہت بڑھ گئی۔ زیارت میں قیام کے دنوں میں ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراک کی وجہ سے ان کی حالت زیادہ تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو دو باورچی کپور تھلہ برادرز کے نام سے مشہور ہیں انہیں زیارت بھیجا جائے، کیونکہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائدِ اعظم کو مرغوب ہے۔ کپور تھلہ کے باورچی بھائیوں کی تلاش ہوئی وہ لاہور چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے۔ لائل پور سے زیارت پہنچے کھانا پکایا اس روز قائدِ اعظم نے چند لقمے شوق سے کھائے۔ کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کو

بلایا۔ کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی۔ وجہ بتائی گئی وہ ناخوش ہوئے چیک بک منگائی باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا اس رقم کا چیک کاٹا رقم سرکاری خزانے میں جمع کرائی۔ باورچی رخصت ہوئے اور کہا یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا (سرکاری خرچ پر) فراہم کرے۔" [۳]

مختار مسعود سوانح نگاری لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں جس کے سبب انہوں نے ایسی شخصیات کی کردار کشائی کی جو قوم کے لیے باعث فخر رہیں، اور عام انسانوں کے مقابلے میں اپنے کردار، مزاج اور علم کے اعتبار سے منفرد اور جدا ہیں۔ مختار مسعود کو اگر ہم سوانح نگاری کا مصور کہیں تو کچھ غلط نہیں ہوگا، کیونکہ انہوں نے اپنے منفرد اسلوب اور لفظوں کے ذریعے شخصیت میں حسن پیدا کیا۔ ان شخصیات کو پڑھ کر ہمیں وہ زندہ جاوید نظر آتی ہیں۔ مختار مسعود کے جملوں کی ترتیب، طرزِ بیان کی شگفتگی، لفظوں کا چناؤ، زبان کی چاشنی، کردار کی سچائی کی وجہ سے ان کے سوانحی شہ پارے بام عروج پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان خوبیوں کی بدولت ملا واحدی کی رائے ملاحظہ کیجیے:

"لفظ قابل داد۔ بعض فقرے لاجواب اور بعض صفحات داد سے بالا۔" [۴]

سوانحِ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ جس شخصیت کی کردار کشائی کی جائے اس کے اندر کچھ ایسی حیران کر دینے والی خصوصیات ہوں جو کہ سوانح نگار کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور اسے لکھنے پر مجبور کر دیں اور لکھنے والے میں بھی وہ جرأت و بیباکی ہو کہ وہ شخصیت سے جڑی تمام سچائیوں کو حقیقت کا روپ عطا کر دے۔ سوانح نگار کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے ممدوح سے ذاتی واقفیت رکھتا ہو۔ وہ اپنے موضوع سے جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنی ہی بہترین سوانح عمری لکھ سکتا ہے۔ اچھا سوانح نگار اپنے مشاہدے اور تاثر کی مدد سے شخصیت کی حقیقی اور اندرونی تصویر قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ سوانح نگار کو انسانی نفسیات کا ماہر ہونا چاہیے۔ سوانح نگار کے لیے بے شمار واقعات بکھرے ہوئے ہیں جن کے انتخاب میں سوانح نگار کو احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے۔ سوانح نگاری

کی صنف اردو میں زیادہ قدیم نہیں ہے سوانح عمریوں کا بیشتر سرمایہ اسی صدی کی پیداوار ہے۔

مختار مسعود کو سوانح نگاری کے فن میں کمال حاصل ہے۔ اس فنِ سوانح نگاری کو انہوں نے نئے تجربات سے آگے بڑھایا، اور معاصر شخصیتوں کی سوانح لکھیں۔ ان کی سوانح عمریوں کی اہم صفت یہ ہے کہ شخصیتوں سے مرعوب نہیں ہوتے اور انہیں حقائق کی روشنی میں پیش کرتے ہیں وہ کسی کی سوانح لکھنے سے پہلے اس شخصیت کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے بعد لطیف طنز کے اشاروں سے اس کی سوانح میں زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

> ''احمد جان کلکتہ میں رہتے اور طبلہ بجاتے تھے اتنا اچھا بجاتے تھے کہ نہیں طبلچی یا طبلیا لکھتے ہوئے دل برا ہوتا ہے۔ طبلہ نواز لکھنا پر تکلف اور نمائشی لگتا ہے۔'' ۵

> ''طبلہ بجانا ان کا واحد اور ہمہ وقتی مشغلہ اور پیشہ تھا کہتے ہیں کہ طبلہ بجاتے بجاتے احمد جان کا داہنا ہاتھ بائیں کے مقابلے میں بھاری ہو گیا تھا۔ مبالغہ آمیزی کے باوجود یہ بات میرے کم عمر اور کم تجربہ حواس پر اس طرح غالب آئی کہ جب میں نے احمد جان کو پہلی بار دیکھا تو ہاتھوں کی ہیئت کا یہ فرق مجھے بھی نظر آیا۔'' ۶

سوانح نگار زیادہ تر شخصیت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے جو اسے عزیز ہوں۔ مختار مسعود نے سوانح نگاری میں جذباتی انداز سے گریز کیا ہے۔ ان کے یہاں تاثرات کم اور حقیقت نگاری زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کا انداز نصیحت آمیز نہیں بلکہ وہ کردار کی خوبیوں سے شخصیت کو محترم و معتبر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مختار مسعود کی سوانح نگاری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ تمام باتیں کر جاتے ہیں مگر تسلسل میں کہیں جھول اور لطف میں کمی نہیں آتی۔ علی گڑھ کی علمی شخصیات کی سوانح انہوں نے جامع اور مفصل انداز میں بیان کیں ہیں، لیکن قاری کی نظر میں ان کی مکمل زندگی کی تصویر سامنے آتی ہے۔ مختار مسعود نے انہی شخصیات پر قلم اٹھایا ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔

انہوں نے شخصیت کی مختصر سوانح اس انداز سے بیان کی ہے کہ اس پر مکمل سوانح عمری کا گمان ہوتا ہے۔ انہوں نے شخصیت کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے اپنے عہد کے کینوس پر پرکھا اور سماجی، معاشرتی اجتمائی میلانات اور عصری واقعات کا مشاہدہ کیا۔ مختار مسعود کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی بڑی شخصیت سے متاثر نہیں ہوتے۔ انہیں شخصیت کے کردار میں جو خامیاں نظر آتی ہیں انہیں وہ بلا خوف و جھجک کے بیان کرتے ہیں۔ وہ کسی شخصیت کے کردار کی خوبیوں اور خامیوں کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں جس انداز سے وہ اس کا حصہ ہیں۔ ان کے نثری شہ پاروں کا مقصد سوانح عمری نہیں لیکن ان شہ پاروں میں سوانح عمریوں کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان سوانح عمریوں میں ربط، تسلسل، سلیقہ مندی، توازن اور اختصار موجود ہے ان کے کردار ہمارے سامنے ہنستے، بولتے، چلتے، پھرتے اصل شکل وصورت میں دکھائی دیتے ہیں، اور یہی سوانح نگاری کا بڑا کمال ہے جن کی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لکھتے ہیں:

> ''نئی دلی کے ایک جدید بنگلے کے بیل منڈھے پورچ کے سامنے رولر پھرے مسطح سبزہ زار میں کرسی پر ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر بیٹھے ہیں پاس ہی مسز سٹیفنی حیدر کھڑی ہیں۔ دونوں کے درمیان پانچ چھ برس کی ایک بچی ہے جس کا نام برلن کی ننھیال اور کہوٹہ کی ددھیال کی دوغلی روایات کے مطابق ڈورتھی ایگنس فاطمہ حیدر ہے۔'' [۷]

مختار مسعود کے اسلوب نے سوانحِ نگاری کے حسن میں تازگی پیدا کر دی ہے جس کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ ان کا مخصوص اور منفرد انداز انہیں دوسرے سوانح نگاروں سے الگ کرتا ہے۔ ان کے واقعات کا بیان براہِ راست اور بے تکلف ہے۔ فقروں کی روانی بے مثل اندازِ بیان اتنا دلکش اور دلفریب ہے کہ سوانح نگاری کا فطری اسلوب معلوم ہوتا ہے جس میں بے تکلفی اور خوشگوار فضا ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح عمریاں سوانح نگاری کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں کے سحر میں قاری کھو جاتا ہے۔ مختار مسعود گوشہ نشین شخص تھے لیکن ان کی

سوانح نگاری نے عمدہ سوانح عمریوں کے نمونے پیش کیے۔ وہ اپنی شخصیت صرف دیکھتے یا پرکھتے ہی نہیں بلکہ اسے محسوس بھی کرتے، اور کردار کی کیفیات خود پر طاری کر لیتے، اس محنت کے ساتھ وہ سوانح عمری قلم بند کرتے۔ وہ اپنی شخصیت کے کردار یعنی موضوع سے وہ ہمدردی نہیں کرتے اور نہ اس کی وکالت کرتے اور نہ کھرا کھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ بلکہ ممدوح کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ان کی سوانح عمریوں میں اپنے کرداروں کی مظلومیت، بے چارگی نہیں ہوتی بلکہ ان کے کردار سانس لیتے اور زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔ وہ خود بھی سنجیدہ اور بردبار شخصیت کے مالک تھے اور ان کی سوانح نگاری میں بھی سنجیدگی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ یہ سنجیدگی قاری کو بیزار نہیں بلکہ دلچسپی کے ساتھ قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے، سرسید احمد خاں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی مخالفت کئی وجوہات کی بنا پر کی گئی۔ کہنے والے کہتے تھے اسے مغربی تمدن کی تیز رفتاری اور مغربی تہذیب کی چکا چوند نے احساس کمتری اور وہم پرستی میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ اہلِ کتاب کے ساتھ کھانا کھاتا ہے لہٰذا اسلام سے خارج ہے۔ وہ جدید تعلیم کا حامی ہے جس کا بنیادی نظریہ، یہ ہے کہ اسلام زمانہ حال کے مطابق نہیں ہے، لہٰذا مسلمانوں کو یہ فرسودہ مذہب ترک کر دینا چاہیے۔ کالج کے ٹرسٹیوں اور انگریز اسٹاف کے تعلقات خراب ہیں کیونکہ سرسید ایک کمزور منتظم ہے وہ انگریزوں کی آنکھوں سے دیکھتا اور ان کے کانوں سنتا ہے۔''[۸]

مختار مسعود کی سوانح نگاری میں تصوف اور روحانیت سے شغف کا جز بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی سوانح عمریوں کو بے جا طول نہیں دیا معیار اور مقدار کے میزان کو کسی ایک طرف جھکنے نہیں دیا اور نہ مبالغہ آرائی کی طرف بڑھے بلکہ اپنے ممدوح کی شخصیت و کردار کو احترام و عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے اس حوالے سے سید ضمیر جعفری کی رائے ملاحظہ کیجیے:

> ''مختار مسعود نے اردو نثر کو خوب صورت ترین پھولوں سے بوند بوند رنگ

اور رس اور خوشبوئیں جمع کر کے بات کہنے کا ایک نیا سلیقہ پیدا کیا ہے، مختار مسعود اپنے جملوں کو ہیروں کی طرح تراشتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے بڑی سے بڑی بات ایک جملے بلکہ ایک نقطے میں ادا ہو جائے۔ ان کا بس چلے تو اوّل سے آخر تک ضرب الامثال لکھتے چلیں جائیں۔ ان کے فقرے ان کے مافی الضمیر کے منجھے ہوئے سفیر ہوتے ہیں۔''۹

مختار مسعود کی سوانح نگاری میں استعمال شدہ محاورات ان کے دلائل کا اہم جز معلوم ہوتے ہیں اور اسی پر ان کے اسلوبِ نگارش کی انفرادیت کی بنیاد ہے۔ ان کی تمام سوانح عمریاں ان کی تصانیف پر بھاری ہیں ان میں تنقیدی شعور واضح نظر آتا ہے جس سے ان کی تحریروں کا رنگ چوکھا ہو گیا ہے انہوں نے انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے ان کے انداز میں تراش ہے نہ بانکپن اور نہ ایسی چکا چوند ہے جو ایک ثانیے کو روشنی دکھا کر اندھیاروں کو اور گہرا کر دے، بینائی اور بصارت کو مفلوج کر دے بلکہ ان کا دھیما پن اور صدیوں کی مٹھاس سے مشفقانہ اور ہمدردانہ لب ولہجہ ذہن کو ایسی رواں، شفاف، ہلکی سہانی روشنی کی دولت عطا کرتا ہے جسے استقرار ہے، دوام ہے ان کی سوانح عمریاں خیالی یا تصوراتی نہیں بلکہ صداقت پر مبنی ہیں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑے غور وفکر کے بعد مطالعہ کی روشنی میں جذبوں اور خلوصِ دل سے لکھا، ان کی تحریروں میں شخصیت کا جمال، جلال، ذہانت، انسانی عظمت، قابلیت، مطالعہ کی وسعت، علم کی تڑپ، عمیق مشاہدہ جیسے عناصر نے ان کے اسلوب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ انہوں نے سوانح عمریوں میں کسی کا اثر قبول نہیں کیا بلکہ وہ اس اندازِ تحریر کے خود ہی موجد تھے، اسلوب ملاحظہ کیجیے:

''۱۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے میں مسلم یونی ورسٹی ہائی اسکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا والد محترم نے فرمایا کہ آج ایک چینی مسلمان عالم ہمارے گھر چائے پر آئے گا مجھے چاہیے کہ اس سے ملوں اور اس کے

آٹوگراف حاصل کروں مہمان کی آمد کی وجہ سے گھر میں سب مصروف تھے مگر اس تجویز کے بعد میری مصروفیت دوسروں سے کچھ زیادہ بڑھ گئی نہ میرے پاس آٹوگراف البم تھی نہ آٹوگراف حاصل کرنے کا تجربہ میں اس کے آداب سے بالکل ناواقف تھا اور واقفیت حاصل کرنے کے لیے صرف دو گھنٹے ملے تھے میں بازار گیا۔ ورما فوٹوگرافر کے یہاں بہت سے البم پڑے تھے مجھے نیلے رنگ کی یہ چھوٹی سی آٹوگراف البم پسند آئی جس میں مختلف رنگوں کے صفحات لگے ہوئے تھے اور جلد پر البم کا لفظ سنہرا چھپا ہوا تھا۔اس کی قیمت صرف چھ آنے تھی ۔اس وقت بھی وہ البم مجھے قیمتی لگی اور میں آج بھی اسے بیش قیمت سمجھتا ہوں ،البتہ ان دنوں وجہ کچھ اور تھی اور ان دنوں کچھ اور سہ پہر جب میں نے نامانوس خال وخط کے مہمان کے سامنے اسے پیش کیا تو بڑی مانوس مسکراہٹ اور شفقت سے انہوں نے میری طرف دیکھا، کچھ باتیں ابا جان سے کیں اور قلم ہاتھ میں لے کر چینی زبان میں تین سطریں لکھیں پھر ان کا لفظی ترجمہ انگریزی میں کر دیا اور دستخط کر کے البم مجھے واپس کر دی ۔ میں بہت خوش ہوا حالانکہ نہ چینی سمجھ میں آئی نہ انگریزی ۔ ہر اچھے آدمی کے گرد ایک ہالہ ہوتا ہے،اس کے نزدیک جائیں تو دل خود بخود منور ہو جاتا ہے۔آج میں روشنی کے اس حلقے میں پہلی بار داخل ہوا ، اپنے اندر اندھیرے چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔'' [۱۰]

مختار مسعود کے سوانحی اسلوب کی مثال ایک آئینہ کی سی ہے جو سورج کی شعاعوں کو دیوار پر اس صورت میں منعکس کرتا ہے جیسی اس کی ساخت ہوتی ہے۔ساخت چوکور، گول یا تکونی ہوتی ہے لیکن اس کی بنیادی روشنی سورج سے مستعار ہوتی ہے اسی طرح سوانح نگاری میں انفرادی

اسلوب سماجی زیست کے اسلوب سے مرتب ہے۔ جس انداز میں عصری سوچ مرتب ہوتی ہے سوانح کا اسلوب اسی رخ پر رہتا ہے۔ مختار مسعود کی سوانح نگاری میں سماجی حقیقت نگاری کی ایک نئی لہر دوڑتی ہے جس نے تازہ فکر کے جدید رویوں کے لیے در کھولے اور سماجی حقیقت نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی وہیں جدید اسالیب کے لیے بھی نئے امکانات پیدا کیے۔ مختار مسعود کا یہ کمال ہے کہ وہ قاری کو تکنیک کے الجھاؤ دقیق فلسفے اور عمیق تجربوں میں نہیں الجھاتے، بلکہ انتہائی خلوص، سادگی اور سچائی سے حقائق کے آئینوں میں کردار کو پیش کرتے ہیں۔

مختار مسعود کے اسلوب کو اس دریا کی مانند بھی قرار دیا جاسکتا ہے جو کسی اُونچے پہاڑ کے دامن سے نکل کر پہاڑوں کو پچھاڑتا، پتھروں کو اُچھالتا، تیز رفتاری سے آتا ہوا میدانوں میں پرسکون ہوجاتا ہے۔ ایک سی رفتار، ایک سا ابھار، نرم رو محتاط اظہار، خاموش بیان اور متانت ان کے اہم اجزا میں شمار ہوتے ہیں۔ مختار مسعود ایک سماجی سوانح نگار ہیں ان کا اسلوب زیست سے تربیت پاتا ہے اور اسی کو ان کی ذات قرار دی جاتی ہے۔ مختار مسعود جس عصر میں زندہ تھے اس عصر کی کئی سطحیں ہیں جس نے انسان کو زوال کی مار پر لا کھڑا کیا ہے۔ محرومی، جبر و تشدد، معاشرتی انحطاط، انسان کی تذلیل، انسانوں کا استحصال، طبقاتی کشمکش، معاشی تفاوت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی برائیاں، تعلیمی انحطاط اور معاشرے کے انگنت پہلو، یہ سب ان کے حساس ذہن میں مرتب تھے اسی احساس کے تحت انہوں نے سوانحیں لکھیں۔ ان کا رشتہ عصری تحریک کے ساتھ جڑا ہوا ہے جس کی وہ الگ شناخت کرواتے ہیں۔

مختار مسعود نے زندگی کا وسیع نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ذات پات اور تعصبات کو مٹا کر انسان کو ایک کُل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سماج کو بدلنے اور زندگی کو بہتر طور پر بنانے کی سعی کی ہے۔ ملکی اور اور قومی مسائل کے ساتھ بین الاقوامی مسائل پر بھی توجہ دی ہے اور بین الاقوامی اور آفاقی شعور سے آشنا کیا ہے۔ اسلوب پر زور دیا ہے۔ کرداروں کی واضح پہچان کروائی ہے۔ مقصدیت اور افادیت پر زور دیا ہے۔ اپنے ہنگامہ خیز عہد کی مکمل سماجی عکاسی کی ہے۔ آزادی کے بعد زندگی

کے نئے مسائل، نئے تجربے اور نئے صدموں نے ان کے یہاں آگہی اور بصیرت کے نئے تجربات پیدا کیے۔ مختار مسعود کی سوانح نگاری کا خاص محور انسان اور انسانی زندگی ہے وہ ایک دردمند انسان تھے۔ وہ ہر ایک کے درد کو محسوس کرتے تھے۔ دکھی انسانیت ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی وہ آزادی پسند، امن دوست نظریہ کے قائل تھے۔ جنگ سے وہ نفرت کرتے تھے۔ انہیں ایک حسین زندگی اور حسین انسانیت کا انتظار تھا۔ وہ انسانی سماج کو حسین اور خوب صورت دیکھنا چاہتے تھے۔ جہاں لوٹ کھسوٹ نہ ہو، ظلم نہ ہو، جبر نہ ہو، ہر انسان اپنی آزادی کے مطابق جی سکے۔

مختار مسعود میں انسان دوستی کا عظیم اور اٹوٹ آدرش اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے انسان پر خدا کی رحمت کا سایہ۔ ان کے تمام نظریات انسان کے لیے تھے۔ انسانی اقدار سے وابستگی نے ان کے مشاہدۂ زندگی کو وسیع اور ان کے تخلیقی اظہار کو مخلص اور غیر مشروط بنائے رکھا، اور یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کو امن و آشتی، مساوات و اخوت اور رحم لی کا درس دیا ہے۔ ان کی محبت اور رحم لی اور انسان دوستی کا دائرہ ایک قوم، ایک مذہب، ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ ساری دنیا کے مظلوم و محکوم، مفلس و نادار، کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے انسانوں سے ہمدردی ہے۔

مختار مسعود کی انسان دوستی، امن پسندی، حقیقت نگاری بہت سے لوگوں کے لیے نہ پسندیدہ بن جاتی ہے۔ کچھ لوگ انسان سے محبت کو سراہتے ہیں اور کچھ پروپیگنڈا قرار دے کر فن کو گردن زدن قرار دیتے ہیں۔ مختار مسعود آخری دم تک اپنے مسلک پر قائم رہے۔ مختار مسعود کے ہاں حقیقت نگاری اور داخلیت سے اجتماعی مسائل کا سفر بار بار ان کی سوانح نگاری میں ملتا ہے ان کا ادبی شعور پختہ تھا۔ سیاسی اور سماجی شعور نے ان کی مقصدیت، حقیقت نگاری اور غیر جانبداری کو پروان چڑھایا۔

مختار مسعود نے اپنی منفرد شخصیت کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار سے منوایا، وہ ایک ذمہ دار،

مہربان، اصول پسند اعلیٰ سرکاری افسر، سادگی پسند اور سادہ مزاج شخصیت کے حامل انسان ہیں۔ یہ صاحب اسلوب نثر نگار مانے جاتے ہیں۔ ادیب کا اظہارِ بیان اسلوب کہلاتا ہے جو اس کی تخلیقات میں جا بجا جھلکتا ہے جس سے اس ادیب کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی تصانیف میں اسلوب کے سارے لوازم وشرائط قائم ہیں۔ مختار مسعود نے اپنی نگارشات میں اُس دور کے حقائق کی نشاندہی کی اور اپنی اسلوبیاتی نثر کے ذریعے قاری تک اپنے خیالات حسن خوبی سے پہنچائے، ان کا اسلوب ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ ان کے اسلوب نگارش میں علی گڑھ کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نثر میں تاریخی واقعات کا بیان ہو یا تاریخی شخصیات کا، قاری کو اپنے سحر میں رکھتی ہے، اور مختار مسعود کی ہر تحریر اپنے اندازِ اسلوب کا شاندار نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب سے ان کے فکر وخیال کے تمام پہلو روشن دکھائی دیتے ہیں، ان کے اسلوب کی واضح خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں طوالت کے باوجود دلچسپی کا عنصر اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔

مختار مسعود نے سوانح نگاری میں جن اشخاص کو متعارف کرایا وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں، انہوں نے ہزاروں انسانوں میں سے چند کامیاب شخصیات کا انتخاب بڑی مہارت سے کیا، یہ شخصیات ہمارے لیے باعث افتخار ہیں، اوران کی یہی خوبی انہیں دوسرے ادیبوں سے ممیز کرتی ہے۔ مختار مسعود کے تمام سوانحی شہ پارے قابلِ ستائش اور لائقِ داد وتحسین ہیں۔ انہوں نے سوانح نگاری میں تخیل، موضوع، مواد، واقعات اور شخصیت کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا اور سوانح نگاری میں جن بنیادی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے اس سے انہوں نے بخوبی استفادہ حاصل کیا، یعنی اصل حقائق کی نشاندہی بھرپور سچائی اور ایمانداری سے کی، اور شخصیت کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کو اپنے الفاظوں کی کاریگری سے خوب صورت جامہ پہنایا۔ مختار مسعود کی تصانیف میں سوانح نگاری کا فن اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، یہی وجہ ہے کہ انہیں سوانح نگاری پر پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ شخصیت پر مضبوط گرفت رکھتے ہوئے افسانوی انداز میں

تحریر کو لکھتے چلے جاتے ہیں اور قاری کو یہی فضا مسحور کن رکھتی ہے۔

مختار مسعود نے سوانح نگاری میں شخصیتوں کی شکل وصورت، اخلاق وذہانیت، حرکات وسکنات اور اندازِ گفتگو پر بھی بھرپور نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور ان کو اتنے لطیف انداز سے اجاگر کیا ہے کہ شخصیتوں کے مکمل مطالعے کے بجائے مختصر جھلک بھی کافی تھی، شخصیات کے ان تاثرات کو انہوں سوانح نگاری میں اس خوبی سے نبھایا ہے کہ سوانح نگاروں کے لیے نئی راہیں کھل گئیں ہیں۔ مختار مسعود سوانح نگاری میں ایک مصور کے طور پر نظر آتے ہیں، وہ اپنے ممدوح کی شخصیت کے ہر پہلو کو تفصیل سے بیان نہیں کرتے بلکہ اس کا تعارف اس انداز سے کراتے ہیں کہ وہ ہستی اپنے مکمل رنگوں کے ساتھ قاری کے سامنے چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی یہ عظیم ہستیاں علی گڑھ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مختار مسعود نے سوانح نگاری میں اپنے دور کے بدلتے ہوئے حالات کو سمونے کی کوشش ہے، اور ان واقعات کو اپنے فکری اور تجزیاتی مشاہدے کی بدولت اس طرح کھنگالا ہے کہ کوئی گوشہ ادھورا اور نامکمل نہ رہ جائے۔

مختار مسعود جدید عہد کے سوانح نگار ہیں۔ ان کی سوانح نگاری کا اسلوب ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے یا ذات کی عکاسی کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ان کی سوانح عمریوں کی تمام شخصیات حقیقت پر مبنی ہیں۔ کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ انہوں نے فرضی کردار تخلیق کیے ہوں، بلکہ انہوں نے جیتی جاگتی شخصیات کو سوانح نگاری میں متعارف کرایا، انہوں نے مرد شخصیات کے ساتھ نسوانی شخصیات کو بھی اپنی سوانحی شہ پاروں کا حصہ بنایا ہے۔ مختار مسعود نے سوانحی شخصیات کے خدوخال، عادت، اطوار اور خوبی خامیوں کو ابھار کر قاری کے سامنے پیش کیا ہے جس سے ان کے ممدوحین کی پرتیں کھل کر سامنے آئیں، کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کے داخلی اور خارجی عوامل جس حد تک کارفرما ہوتے ہیں، مختار مسعود نے اس کی جھلک بڑی خوبی سے دکھائی ہے۔ انہوں نے اپنی سوانحی شخصیت کو نہ صرف دیانتداری و ایمانداری کے ساتھ جیسا پایا ویسا ہی پیش کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ جڑے واقعات کو بھی من وعن بیان کیا ہے، وہ اپنی

شخصیات کے لیے عقیدت واحترام کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مختار مسعود نے سوانح نگاری میں اپنی تمام توجہ اپنے ممدوحین کی شخصیت پر اس طرح رکھی ہے کہ جس سے حقیقت کا گمان ہو، اس کے لیے انہوں نے تمام سوانحی مواد اپنے مطالعے، مشاہدے اور وسیع معلومات سے حاصل کیا۔ مختار مسعود کو اپنی سوانحی شخصیات سے جذباتی لگاؤ تھا اس کے باوجود انہوں نے اپنے ممدوحین کے ظاہری خدوخال کے ساتھ باطنی خدوخال کو بھی نمایاں کر کے غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا اور ان کے حلیہ میں بھی قاری کے لیے دلچسپی کا پہلو برقرار رکھا ہے۔

مختار مسعود کی شخصیت جدید اردو ادب کا ممتاز حوالہ ہے، ان کی طبع فیض رساں نے سوانح نگاری کو بھی اپنایا ہے۔ ان کی سوانحِ نگاری کے مطالعے کے دوران احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے نفسیاتی طور پر اپنی شخصیات کا جائزہ لیا اور ایسے واقعات کا انتخاب کیا جس سے ان کے نفسیاتی پہلوؤں کو ابھار کر سوانح نگاری کی بنت کرنے لگتے ہیں۔ ان کی سوانح نگاری میں دلکشی کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کی زیادہ تر سوانحی شخصیات سے ان کے قریبی مراسم تھے یا وہ انہیں بہت قریب سے جانتے تھے۔ ان کے قلم نے بڑی عمدگی سے اپنے ممدوحین کی سوانح لکھیں، اور نہ صرف اُن کی خوبیوں بلکہ خامیوں کو بھی سوانح نگاری کا حصہ بنایا، اور ان کی صرف مداح سرائی نہیں کی، انہوں نے کچھ ایسے لوگوں کی سوانح بھی قلم بند کیں جو بظاہر عام سے تھے لیکن ان کے زورِ قلم نے اُن میں ایسی دلکشی پیدا کی جو قاری کی دلچسپی کا سامان بن گئیں اور ان شخصیت کے نقوش ذہن میں موجود رہتے ہیں۔

مختار مسعود کی سوانح نگاری میں اسلوب اور زبان خالص علی گڑھ کی مرہونِ منت ہے۔ ان کی سوانح نگاری علی گڑھ کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا نمونہ پیش کرتی ہے، مختار مسعود کی سوانح نگاری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کم الفاظ میں بڑی بات سلیقے اور ہنر مندی سے کرتے ہیں۔ انہوں نے عمدہ اور نفیس الفاظ سے شخصیت کی کردار نگاری کی، اردو ادب میں بہت کم سوانح نگار اس خوبی سے مالا مال ہیں۔ وہ قلم سے قرطاس پر الفاظوں کو منتقل کرتے وقت بہت احتیاط سے کام لیتے

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں کوئی لفظ بھی بے کار یا بے محل نظر نہیں آتا، الفاظ اور جملوں کا چناؤ اور نشست کی مناسبت بڑے تراش کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ ہی ان کے اسلوبِ نگارش کا منفرد کمال ہے۔ اردو سوانح نگاری مختار مسعود کے جدا اسلوبِ نگارش کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے یہاں سوانح نگاری میں نہ صرف فنی تقاضوں سے آگاہی ملتی ہے بلکہ سوانح کی نئی اور توانا روایات بھی سامنے آتی ہیں، جن میں حقیقت اور واقعات کا امتزاج بہت دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ جس سے وہ ایک اعلیٰ پائے کے سوانح نگار معلوم ہوتے ہیں۔

مختار مسعود کی سوانح نگاری کے بنیادی عناصر سنجیدگی و متانت اور محتاط اظہار خیال ہے ان کی سوانح نگاری کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے لفظوں کا انتخاب بھی کانٹ چھانٹ اور ٹھونک بجا کر کیا جس سے ہر لفظ اور جملہ اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی سوانح نگاری کے لیے ان شخصیات کو منتخب کیا ہے جن کی کسی نہ کسی خوبی سے وہ متاثر نظر آئے، سوانح نگاری میں مختار مسعود ایک ایسے سوانح نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں جس نے صنفِ سوانح نگاری کی شخصیات کو بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہوں نے شخصیت کا انتخاب کر کے اسے جوں کا توں پیش نہیں کیا، بلکہ اس کے ان منفرد پہلوؤں کو ابھارتے اور اجاگر کرتے ہیں جن کا مشاہدہ انہوں نے بہ چشم خود کیا ہے، اور اس میں خیالات و افکار کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ تسلسل کے ساتھ ذہن میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

مختار مسعود کے اسلوب میں سوانحِ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر سوانح نگاری تو نہیں کی لیکن جہاں کہیں کسی شخص یا کردار پر انہوں نے بات کی وہاں اس کی شخصیت کو اپنے منفرد اور واضح انداز سے اس طور پیش کیا ہے کہ اس کے کردار کے تمام پہلو روشن ہوئے اور الفاظوں کے خوب صورت چناؤ کے باعث انہیں معتبر اور معزز بنا کر پیش کیا۔ جس سے قاری کو خوشگواری کا احساس ہوتا ہے، اور وہ شخصیت کی تصویر اپنے سامنے ہو بہو محسوس کرتا ہے، یہ سوانحی شہ پارے انہوں نے ان لوگوں کے تخلیق کیے ہیں جن سے انہیں محبت و عقیدت تھی۔ سوانح

نگاری کے اصول اور نقادوں کی آرا کچھ بھی ہو، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریروں میں سوانح نگاری کے نقوش بہت گہرے ہیں۔

مختار مسعود کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ شخصیت کی کلید ہاتھ آ جائے کوئی ایسی کلید جس سے قصرِ شخصیت کے تمام بند دروازے کھل سکیں، شخصیت کے تمام مظاہر کی توجیہ کی جا سکے۔ وہ حکمران جذبہ یا چند جذبوں کی کوئی ایسی ہیئت ڈھونڈ نکالی جائے جسے شخصیت کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کا مصدر و ماخذ قرار دیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن اس کوشش میں اگر کامیابی حاصل ہو جائے تو مزاج اور شخصیت کی ایک ایسی قابلِ اعتماد تصویر بنائی جا سکتی ہے جسے سوانح نگاری کا منتہا قرار دیا جا سکے۔

مختار مسعود نے سوانح نگاری میں مشہور اور متاثر کن شخصیات کے خدوخال کو اپنے زورِ قلم سے اُجاگر کیا، اور ان کے خیالات و نظریات پر بحث کی۔ یہ شخصیات ان کے عہد کی روشن و درخشاں ہستیاں ہیں، جنھیں انہوں نے شاندار انداز سے نمایاں کیا اور توازن و اعتدال کے حسن کو برقرار رکھا، ان شخصیتوں کو انہوں نے اپنی زندگی میں قریب سے دیکھا اور پرکھا، سوانح نگاری یا شخصیت نگاری میں مختار مسعود کا اندازِ بیان دلفریب ہے۔ تخلیق کی یہی خوبی فکری جہتوں کی بلند پرواز ہے جس طرح سے انہوں نے فنِ سوانح نگاری کو اپنی تحریروں میں برتا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو نثر میں خوب صورت اضافہ ہے۔ انہوں نے شخصیت کے کمزور پہلوؤں کا تذکرہ بھی اس انداز سے کیا کہ کمزوریاں نفرت کا سبب نہ بنیں، اور اگر وہ نفرت انگیز ہیں بھی تو سوانح کے آئینے میں اُن سے نفرت نہ ہو سکے، بلکہ قاری ان کمزوریوں کو تقاضائے بشریت سمجھ کر درگزر کرنے پر تیار ہو جائیں۔ سوانح نفرتوں کا نہیں محبتوں کا سلسلہ ہے، یہ صرف محبّ کی نظر ہے کہ شخصیت کی کمزوریوں کو جاننے اور ماننے کے باوجود نفرت نہیں کرتا بلکہ محبت ہی کیے جاتا ہے۔

مختار مسعود کی سوانحِ نگاری میں کردار نگاری کے ساتھ ایک اہم خوبی جزئیات نگاری ہے وہ کسی بھی منظر کو سرسری انداز میں پیش نہیں کرتے بلکہ زندگی کے معمولی مناظر کی روشنی میں شخصیت

کا عکس نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اور جزئیات کے ساتھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور وہ ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے اپنے آپ کو اُس ماحول کا حصہ سمجھنے لگتا ہے یہ جزئیات نگاری ان کے گہرے مشاہدے اور باریک بینی کا نچوڑ ہے۔

مختار مسعود کی سوانح نگاری کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو ان کی شخصیت کے پس منظر میں اُس دور کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ مختار مسعود نے اپنے سوانحی شہ پاروں میں تہذیبی قدروں، ادبی، سیاسی اور سماجی صورتِ حال کو اس ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ ان کے دور کی روح ان کی سوانح نگاری میں سمٹ آئی ہے۔ یہ سوانح نگاری شخصیت کی عکاسی کے ساتھ اس دور کا منظر نامہ بھی پیش کرتی ہے۔ مختار مسعود نے شخصیات کے کرداروں میں اپنے جذبات، احساسات، تجربات، عادات واطوار، رہن سہن وغیرہ کو بھی بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ مختار مسعود سوانح نگاری کے فن سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں اور بہ حیثیت سوانح نگار ذہین، محنتی، دیانت دار، روادار، دردمند، ہمدرد اور مہذب ثابت ہوئے ہیں۔

مختار مسعود کو سوانح نگاری کے فن میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کی روایت کو انہوں نے فروغ دیا اور معاصر شخصیتوں کی سوانح لکھیں۔ مختار مسعود کی یہ سوانح عمریاں کئی طرح کے افراد کی سیرت و شخصیت سے متعلق ہیں۔ اپنے ہم عصروں کے علاوہ انہوں نے اکابرینِ ملت، ارباب سیاست اور مشاہیر زمانہ ہستیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آدمی ذات پات سے بڑا نہیں ہوتا بلکہ اس کی صفات اسے ممتاز کرتی ہیں۔ ان کی سوانح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شخصیتوں سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ انہیں حق گوئی و بے باکی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ سوانح نگاری کے لیے شخصیت سے جتنی ہمدردی اور قدرے جذباتی لگاؤ ہونا چاہیے اس کی ان کے ہاں کمی نہیں، کوئی شخص دنیا میں بشری تقاضوں سے عاری نہیں ہوسکتا شخصیت خوبیوں اور کوتاہیوں دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے، مختار مسعود بھی اپنی سوانحی شخصیتوں کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی سوانح نگاری کا ایک صحت مند نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ وہ شخصیتوں کو ان کے مخصوص عہد اور حالات کے تناظر میں

دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ مختار مسعود کے یہاں اسے سرسید کا فیضانِ تربیت سمجھنا چاہیے، لیکن ایسا نہیں کہ وہ صرف قدروں کو ہی عزیز رکھتے ہیں اور شخصیت کو فراموش کردیتے ہیں بلکہ انہوں نے اقدار وصفات کی مدد سے شخصیتوں کی متحرک اور زندہ جاوید سوانح لکھنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے سوانح میں بہت محتاط رویہ اختیار کیا ہے کہ شخصیت کے خاص پہلو ہی اُجاگر ہوسکیں۔ جس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

مختار مسعود نے سوانح نگاری میں جذباتی انداز اختیار کرنے سے گریز کیا ہے، ان کے ہاں تاثرات نگاری کم اور حقیقت نگاری زیادہ ملتی ہے۔ وہ اپنی شخصیتوں کے اوصاف بیشتر انسانوں میں دیکھنا چاہتے ہیں جن کی بدولت کوئی شخصیت معتبر ومحترم ہوجاتی ہے۔ انہوں نے شخصیتوں کے سیرت وکردار اور ذہن ومزاج کو دنیا کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کیا، اور نئے آنے والوں کے لیے ایک آزمودہ راہِ عمل متعین کی ہے۔ سوانح نگاری ایک فن ہے جس میں شخصیت کو دنیا کے سامنے مشعلِ راہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جسے دیکھ کر دوسروں میں حوصلہ اور اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ مختار مسعود کی سوانح نگاری کا یہ فن اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہے، اور اصل میں یہ ہی سوانح نگاری ہے۔ انہوں نے شخصیت کی سوانح لکھنے کے لیے پہلے اس شخص کا بغور مطالعہ کیا اور غور وفکر سے کام لیتے ہوئے اُس کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے تجزیاتی نقطہ نظر اور طنز کے لطیف اشاروں کی مدد سے پیش کردہ سوانح نگاری میں اپنے قلم سے شخصیت میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ سوانح نگاری پر قلم اٹھاتے ہوئے یہ لازمی ہے کہ اس شخص کی زندگی میں پیش آنے والے تمام کارناموں پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا جائے تاکہ شخصیت پورے خدوخال کے ساتھ نمایاں ہوسکے اور مختار مسعود میں یہ التزام موجود ہے۔

مختار مسعود بہترین سوانح نگار ہیں۔ انہوں نے اپنی منفرد نثر کی بدولت سوانح نگاری کا معیار بھی جدا رکھا، ان کی سوانح نگاری میں انسانی خوبیوں اور خامیوں کو جس فنکارانہ انداز سے اجاگر کیا ہے اس میں ممدوح کی مدح سرائی نہیں بلکہ جیسا اسے دیکھا ویسا ہی سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا یہی

اچھوتا انداز انہیں اپنے ہم عصروں سے جدا رکھتا ہے۔ یہ اپنی شخصیتوں کے صرف ادبی پہلوؤں کو نمایاں نہیں کرتے بلکہ اس کی شخصیت اور اخلاقی پہلوؤں سے بھی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بحث کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ صرف عیب جوئی سوانح نگاری نہیں ہے اور نہ ہی عیب پوشی کا نام سوانح نگاری ہے۔ میرے نزدیک تو خوفِ خدا کے ساتھ فن کارانہ عکاسی کا نام سوانح نگاری ہے۔

مختار مسعود کی سوانح نگاری میں تنوع و توازن، یکتا اُسلوبِ بیان، زبان پر قدرت، ادب کا گہرا مطالعہ معاشرہ کا عمیق مشاہدہ اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے ان کے سوانحی شہ پاروں میں بھی ایک خاص قسم کی جاذبیت اور دلکشی موجود ہے کہیں کہیں ثقیل الفاظ در آتے ہیں، لیکن اس سے ان کا اسلوب دقیق نہیں ہوتا کیوں کہ جملہ معنی خود واضح کر دیتا ہے۔ انہوں نے جملوں کی در و بست اور تنظیم میں اختصار صحت اور جامعیت سے کام لیا۔ اس سے ان کی مرقع نگاری میں ایک ادبی شان پیدا ہوگئی۔ سوانحِ نگاری میں مختار مسعود کا مضبوط کامل اظہار ''حرفِ شوق'' اور جزوی طور پر ''آوازِ دوست''، ''سفر نصیب'' اور ''لوحِ ایام'' خود نوشت کا رنگ غالب ہے۔

مختار مسعود سوانح نگار اور سوانح کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ سوانح نگاری میں کامیاب رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب کسی قدر تفصیل کا طالب ہے۔

سوانح نگار اپنے ممدوح کی شخصیت کے تین پہلوؤں کو ضرور گرفت میں لاتا ہے۔:۔

۱۔ وہ باتیں جنھیں کردار کی خوبی سمجھتا ہے، جیسے حیا، خلوص، معصومیت، رواداری، ایثار، اور تحمل وغیرہ۔

۲۔ وہ باتیں جن سے منفی پہلو سامنے آئے، جیسے خود غرضی، بدزبانی اور جنسی بے راہروی وغیرہ۔

۳۔ وہ باتیں جو نہ اس کی ظاہری شخصیت کو متاثر کرتی ہیں، جیسے بے موقع لباس پہننا، نشست و برخاست میں بے ترتیبی، گفتگو میں اعتدال سے گریز، یادوں سے جی بہلانا، خوشی کے موقع پر اُداس ہو جانا وغیرہ۔

جہاں تک پہلی اور تیسری قسم کی باتوں کا تعلق ہے مختار مسعود کامیاب رہے ہیں بلکہ کچھ جگہوں پر ان کی کامیابی قابلِ رشک ہے۔ دوسری قسم کی باتیں لکھنے میں متعدد مواقع کے باوجود، وہ دوسرے سوانح نگاروں سے کہیں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ اس جواب سے ایک اور سوال اُبھر آیا کہ اگر مختار مسعود کامیاب سوانح نگار ہیں تو اردو سوانح نگاری میں ان کا کیا مقام ہے؟

مختار مسعود کی سوانح نگاری کے مختلف انداز و اسلوب کے حوالے سے ابھی اردو ادب کے ناقدین پوری طرح متوجہ نہیں ہیں لیکن سوانحی ادب میں ایک دن ناقدینِ ادب ان کو سوانح نگار کی حیثیت سے یقیناً تسلیم کرلیں گے۔ مقام ومرتبے کا تعین مستقبل کا غیر خانبدار ناقد کرے گا لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ سوانح نگاری سے ان کی دلچسپی جز وقتی نہیں بلکہ کل وقتی اور شعوری ہے۔

مختار مسعود کی تصانیف میں شخصیت نگاری کے فن کو مشتاق احمد یوسفی نے بھی سوانح نگاری کا درجہ دیا ہے اور وہ ان کی تصنیف ''آوازِ دوست'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک مینار کی کہانی نہیں اور نہ سوانح عمری ہے ان مشاہیر کی، جن کے ناموں اور کارناموں کا اس میں ذکر آ گیا ہے۔ یہ ایک متحدہ اور اٹوٹ مسلم قومیت کے خواب اور اس کی تعبیر کی دل افروز داستان ہے۔ برِ کوچک کے ایک نشاۃِ ثانیہ کا عظیم ''ساگا'' ہے اس کی تحریک کے آغاز سے اس تحریک کے انجام تک، مصنف کے خانہ دل میں محفوظ ہیں سب یاد یں اور یاد ہیں سب باتیں۔''[11]

مختار مسعود کی سوانح نگاری کے فنی وفکری پہلوؤں کے مطالعے اور تجزیے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کس طرح تہذیب وثقافت سے زبان وبیان کے لوچ کو چابکدستی سے مختار مسعود نے قلم بند کیا ہے۔ کسی بھی معاشرے کا سماجی پس منظر ادب کی تخلیق میں کلیدی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور قاری بھی اسی وقت بہتر انداز میں ذہنی ہم آہنگی محسوس کر پاتا ہے جب اس کو سماجی اور تہذیبی آگہی حاصل ہو، ان دونوں نکات پر مختار مسعود نے خصوصی توجہ دی ہے۔

زندگی ایک فن ہے، اور خودنوشت رسوانحِ نگاری فنِ لطیف اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مختار مسعود نے بڑی سچائی اور دیانت سے کام لیا، آپ کی سوانح نگاری میں ذات و واقعات میں ایک حد فاضل موجود ہوتا ہے۔ مختار مسعود کی سوانح نگاری میں شعوری یا لاشعوری اخفا نہیں ہوتا البتہ واقعات کی کاٹ چھانٹ یا اختصارِ بیان سوانح نگار کا حق ہے، اور اس حق کو انہوں نے بھی خوب استعمال کیا۔ ادبی، اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی روایات کے باعث یہ ممکن نہیں کہ زندگی کی واردات و شب و روز کو معیار سے ہٹ کر لکھا جائے۔ مختار مسعود تہذیبی تسلسل کے علمبردار ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح نگاری میں پاسداری اور عدلِ قلم کا اہتمام بدرجہ اُتم موجود ہے۔ مختار مسعود نے ان شخصیات کو سوانح عمری کا موضوع بنایا ہے جو اپنی کسی نہ کسی وصف کی بنا پر ان کے ذہن وقلب پر ثبت رہے انہیں اپنے سوانحی شہ پاروں میں کُل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں ان کے فکروفن کے مختلف دریچے واکرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک بنیادی طور پر مختار مسعود سوانح نگار ہیں۔ مختار مسعود نے اردو سوانح نگاری میں جو رنگ پیدا کیا ہے وہ بالکل ایک نئی چیز ہے۔ ان کی سوانح نگاری میں مشاہدہ اور حقیقت کا امتزاج ملتا ہے جو ہندوستانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ فطرتاً تخیل پسند ہیں لیکن وقت اور ماحول کے تقاضوں نے حقیقت پرست اور واقعیت پسند بنا دیا، ان کا طرزِ ادا دلکش ہے۔ ایسی زبان اور منفرد اسلوبِ بیان اردو کے بہت کم ادیبوں کے نصیب میں آیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ معجزۂ فن کی نمود خون جگر سے ہوتی ہے۔ اگر مختار مسعود نے اپنی تخلیقات کی آبیاری خونِ جگر سے نہ کی ہوتی تو انہیں وہ مقبولیت نصیب نہ ہوتی جو ان کی سوانح نگاری کی ضامن ہے۔

مختار مسعود کی سوانحِ نگاری کے تنقیدی جائزے کے بعد یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں انہوں نے ''حرفِ شوق'' میں کلیتاً ''آوازِ دوست'' اور ''سفر نصیب'' میں گاہے بگاہے سوانحِ نگاری کے فنی محاسن کی تمام جزئیات کو کماحقہ اختیار کیا ہے۔ اور سوانح نگاری کو مدحت نہیں بنایا بلکہ مستقبل کے لیے راہیں روشن کرنے کے ساتھ ہی، ماضی کی تہذیبی، ثقافتی، ادبی روایات اور زبان و بیان

کے ادبی معیار کو سند کا درجہ دینے کے ساتھ ہی اسلوبِ نگارش کی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ انہوں نے سوانح نگاری میں ممدوح کو انسان ہی رکھا ہے، فرشتہ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

☆☆

حواشی

۱۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۱۶۱

۲۔ آوازِ دوست میری رائے میں، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، (مرتب) امر شاہد، ص ۲۰۳

۳۔ مختار مسعود، لوحِ ایام، ص ۳۷۹

۴۔ آوازِ دوست میری رائے میں، ص ۲۰۲

۵۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۲۰۴

۶۔ ایضاً

۷۔ مختار مسعود، سفر نصیب، ص ۱۳۲

۸۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، ص ۳۱۴

۹۔ سیّد ضمیر جعفری، آوازِ دوست، مشمولہ: شاہکار کتابیں، مدیر سید قاسم محمود، مکتبہ شاہکار لاہور، یکم مئی ۱۹۷۵ء، ص ۳

۱۰۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، ص ۵۱۔۵۲

۱۱۔ آوازِ دوست میری رائے میں، مشمولہ: صاحبِ آوازِ دوست، (مرتب) امر شاہد، ص ۲۰۳

☆☆

فہرستِ کتب محولہ

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۱۔ آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	سرفراز پریس لکھنو	۱۹۵۵ء
۲۔ آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر	شبلی ایک دبستان	ڈھاکہ	۱۹۵۷ء
۳۔ اکرام اللہ ندوی	وقار حیات	مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ	۱۹۲۵ء
۴۔ احسان دانش	جہان دانش	القائم آرٹ پریس، لاہور	۱۹۷۵ء
۵۔ احسان دانش	اردو مترادفات	مرکزی اردو بورڈ، لاہور	۱۹۷۰ء
۶۔ الطاف حسین حالیؔ	حیاتِ سعدی	برقی آرٹ پریس، دہلی	۱۹۷۰ء
۷۔ الطاف حسین حالیؔ	یادگارِ غالبؔ	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۳ء
۸۔ الطاف حسین حالیؔ	حیاتِ جاوید	اکیڈمی پنجاب ٹرسٹ، لاہور	۱۹۵۷ء
۹۔ اشرف صبوحی دہلوی	دلی کی چند عجیب ہستیاں	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۲۰۱۲ء
۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر	نقوشِ رفتگاں	کلاسک، لاہور	۲۰۱۰ء
۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر	اردو ادب کی مختصر تاریخ	عزیز بک ڈپو، لاہور	۱۹۸۸ء
۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر	انشائیہ اردو ادب میں	مکتبہ فکر و خیال، لاہور	۱۹۸۵ء
۱۳۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتبہ)	کشاف تنقیدی اصطلاحات	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۸۵ء
۱۴۔ اکبر حمیدی (مرتبہ)	جدید اردو انشائیہ	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	۱۹۹۱ء
۱۵۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر (مرتبہ)	اردو میں اصول تحقیق	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۸۶ء
۱۶۔ افتخار احمد صدیقی	مولوی نذیر احمد (احوال و آثار)	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۸ء
۱۷۔ الطاف فاطمہ	اردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقا	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۶۱ء
۱۸۔ الہاشمی طالب	اصلاح تلفظ و املا	القمر انٹر پرائزز، لاہور	۲۰۰۱ء
۱۹۔ الطاف یوسف زئی، ڈاکٹر	مختار مسعود کا اسلوب	مثال پبلشرز، فیصل آباد	۲۰۱۳ء
۲۰۔ امر شاہد (مرتبہ)	صاحب آواز دوست	بک کارنر، جہلم	۲۰۱۷ء

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۲۱۔ امداد صابری	دہلی کی یادگار ہستیاں	دہلی	۱۹۷۲ء
۲۲۔ اطہر رضوی	چہرے باتیں یادیں لوگ	اکادمی بازیافت، کراچی	۲۰۰۸ء
۲۳۔ الٰہی مقبول	اردو میں مستعمل عربی وفارسی ضرب الامثال	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۹۶ء
۲۴۔ امرتا پریتم	رسیدی ٹکٹ	بک کارنر، جہلم	۲۰۱۷ء
۲۵۔ اختر حسین رائے پوری	گرد راہ	مکتبہ افکار، کراچی	۱۹۸۴ء
۲۶۔ ادارہ	محاورات وضرب الامثال	فیروز، سنز، لاہور	س ن
۲۷۔ ابوالحسن علی ندوی	حیات عبدالحئی	نامی پریس، لکھنو	۱۹۷۰ء
۲۸۔ اعجاز حسین	نئی ادب ر جحانات	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	۱۹۵۷ء
۲۹۔ اسلم پرویز	انشاء اللہ خان انشاء (عہد اور فن)	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱۹۶۱ء
۳۰۔ اختر صدیقی	غالب اپنے آئینے میں	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	۱۹۷۰ء
۳۱۔ اسلم جیراج پوری	حیات جامی دیباچہ	مطبع فیض عام علی گڑھ	۱۹۱۸ء
۳۲۔ اعجاز الحق قدوسی	میری زندگی کے پچھتر سال	مکتبہ اسلوب، کراچی	۱۹۸۸ء
۳۳۔ اسلم فرخی	گلدستہ احباب	مکتبہ دانیال، کراچی	۱۹۹۴ء
۳۴۔ اخلاق احمد، دہلوی	یادوں کا سفر	مکتبہ عالیہ، لاہور	۱۹۹۱ء
۳۵۔ بدرالدین قادری رضوی	سوانح اعلیٰ حضرت احمد رضا	لاہور	۱۹۶۳ء
۳۶۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر	خاکہ نگاری: فن وتنقید	نذیر سنز پبلشرز، لاہور	۱۹۹۰ء
۳۷۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر	پس نوشت اور پس پس نوشت	نیاز مانہ پبلیکیشنز، لاہور	س ن
۳۸۔ تنویر احمد دہلوی	اصول تحقیق وترتیب متن	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۳۹۔ جوش ملیح آبادی	یادوں کی بارات	مکتبہ شعروادب، لاہور	۱۹۷۵ء
۴۰۔ حکیم احمد شجاع	خوں بہا	مرکنٹائل پریس، لاہور	۱۹۴۳ء
۴۱۔ حسن وقار گل، ڈاکٹر	اردو میں سوانح نگاری آزادی کے بعد	شعبہ اردو، جامعہ کراچی	۱۹۹۷ء
۴۲۔ خلیق انجم	مرزا محمد رفیع سودا	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۶۶ء
۴۳۔ خالد اقبال یاسر (مرتبہ)	ادبی جائزے	اکادمی ادبیات، پاکستان	۱۹۸۶ء

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۴۴۔ دیوان سنگھ مفتون	ناقابل فراموش	کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۵۸ء
۴۵۔ ذوالفقار علی بخاری	سرگزشت	کراچی	۱۹۶۶ء
۴۶۔ رشید حسن خان	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۸ء
۴۷۔ رشید حسن خان	اردو املا	مجلس ترقی ادب، لاہور	۲۰۰۷ء
۴۸۔ رشید احمد صدیقی	ہم نفسان رفتہ	لاہور	۱۹۷۱ء
۴۹۔ رشید احمد صدیقی	ہمارے ذاکر صاحب	کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۳ء
۵۰۔ زاہد حسین انجم	ہمارے اہل قلم	ملک بک ڈپو، لاہور	۱۹۸۸ء
۵۱۔ سید سلیمان ندوی	حیات مالک دیباچہ	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۴۰ء
۵۲۔ سید سلیمان ندوی	حیات شبلی تمہید	سلسلہ دارالمصنفین	۱۹۴۳ء
۵۳۔ سید سلیمان ندوی	سیرت عائشہ	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۱۷ء
۵۴۔ سرسید احمد خاں	سیرت فریدیہ	مطبع مفید عالم آگرہ	۱۸۹۶ء
۵۵۔ سرسید احمد خاں	آثار الصنادید	سینٹرل بک ڈپو اردو بازار، دہلی	۱۹۶۵ء
۵۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر	میر امن سے عبدالحق تک	سود پریس، دہلی	۱۹۶۵ء
۵۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر	سرسید اور ان کے نامور رفقاء	لیتھو پریس، دہلی	۱۹۶۰ء
۵۸۔ سید عابد علی عابد	اسلوب	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۹۶ء
۵۹۔ سعادت حسن منٹو	گنجے فرشتے	سویرا آرٹ پریس، لاہور	۱۹۵۳ء
۶۰۔ سبط حسن	نیا ادب کیا ہے؟	حلقہ ادب، لکھنو	۱۹۴۱ء
۶۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر	اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۹۸ء
۶۲۔ سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر	ہمارے عہد کا ادب اور ادیب	قمر کتاب گھر، کراچی	۱۹۷۱ء
۶۳۔ سید شاہ علی، ڈاکٹر	اردو میں سوانح نگاری	رائٹرز گلڈ پاکستان، کراچی	۱۹۶۱ء
۶۴۔ سید ضمیر جعفری	کتابی چہرے	نیرنگ خیال پبلی کیشنز، راولپنڈی	۱۹۷۶ء
۶۵۔ سید احتشام حسین	جدید ادب	اتر پردیش، اردو اکیڈمی لکھنو	۱۹۶۸ء
۶۶۔ سید احتشام حسین	ادب اور سماج	کتب پبلشرز، بمبئی	۱۹۴۸ء

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۶۷۔ سید عشرت حسین (ترتیب) ملا واحدی	حیاتِ اکبر	کلیم پریس، کراچی	۱۹۵۱ء
۶۸۔ سلیمان اطہر جاوید	رشید احمد صدیقی	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس	۱۹۷۶ء
۶۹۔ سلطانہ مہر	گفتنی (جلد اول)	مہر بک فاؤنڈیشن، کیلی فورنیا امریکہ	۲۰۰۰ء
۷۰۔ سلطانہ مہر	گفتنی (جلد دوم)	مہر بک فاؤنڈیشن، لاس اینجلس، امریکہ	۲۰۰۴ء
۷۱۔ سیدہ انیس فاطمہ، بریلوی	یاد اور خاکے	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی	س۔ن
۷۲۔ سید احمد، قادری	تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی	شاد بک ڈپو، پٹنہ انڈیا	۱۹۵۰ء
۷۳۔ شفیع عقیل	مجید لاہوری	اردو پریس میکلوڈ روڈ، لاہور	۱۹۵۸ء
۷۴۔ شیخ محمد اکرام	غالب نامہ	قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور	۱۹۳۹ء
۷۵۔ شیخ محمد اکرام	شبلی نامہ	تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی	س ن
۷۶۔ شیخ محمد اکرام	یادگارِ شبلی	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۱۹۷۱ء
۷۷۔ شاہ معین الدین ندوی	حیاتِ سلیمان	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۷۳ء
۷۸۔ شیخ عطا اللہ (ترتیب نو)	اقبال نامہ	اقبال اکادمی پاکستان، لاہور	۲۰۱۲ء
۷۹۔ شہناز انجم، ڈاکٹر	ادبی نثر کا ارتقاء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	۱۹۸۵ء
۸۰۔ شاہد حنائی	اردو خاکہ نگاری فن۔ تاریخ۔ تجزیہ	اکادمی بازیافت	۲۰۱۵ء
۸۱۔ شان الحق حقی (مرتبہ)	فرہنگ تلفظ	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۹۵ء
۸۲۔ شان الحق حقی	لسانی مسائل و لطائف	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۹۶ء
۸۳۔ شجاع احمد زیبا، پروفیسر	اردو میں قلمی خاکے	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی	۱۹۹۳ء
۸۴۔ شورش کاشمیری	بوئے گل نالہ دل دودِ چراغ محفل	الفیصل، لاہور	۲۰۱۴ء
۸۵۔ شاہد احمد دہلوی	گنجینۂ گوہر	مطبع سعیدی، کراچی	۱۹۶۲ء
۸۶۔ شاہد احمد دہلوی	بزمِ خوش نفساں	مکتبہ اسلوب، کراچی	۱۹۸۴ء
۸۷۔ صالحہ عابد حسین	یادگار حالی	کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۵۵ء
۸۸۔ صابر علی خان، ڈاکٹر	سعادت یار خان رنگین	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۵۶ء

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۸۹۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر	اردو میں خودنوشت سوانح حیات	لکھنو	۱۹۸۲ء
۹۰۔ صابرہ سعید، ڈاکٹر	اردو ادب میں خاکہ نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۰۹ء
۹۱۔ صادق الخیری	میری زندگی فسانہ	کراچی	۱۹۸۶ء
۹۲۔ طیبہ خاتون	اردو میں ادبی نثری تاریخ	پاکستان ایجوکیشنل پبلشر، کراچی	۱۹۶۱ء
۹۳۔ عطش درانی، ڈاکٹر	جدید رسمیات تحقیق	اردو سائنس بورڈ، لاہور	س ن
۹۴۔ عبدالماجد دریابادی	محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۵۴ء
۹۵۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر	یاد عمر رفتہ	لاہور	۱۹۸۸ء
۹۶۔ عبدالمجید سالک	ذکرِ اقبال	دین محمدی پریس، لاہور	۱۹۵۵ء
۹۷۔ علی زیب النساء خان	مشترکہ ضرب الامثال	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۲۰۰۵ء
۹۸۔ علی حیدر ملک	ادبی معروضات	میڈیا گرافکس، کراچی	۲۰۰۷ء
۹۹۔ عبداللطیف اعظمی	بابائے اردو مولوی عبدالحق	ادارہ فروغ اردو، لکھنو	۱۹۷۱ء
۱۰۰۔ عفت سرفراز	سہ ماہی الزبیر۔ بہاولپور۔ خصوصی شماروں کا ادبی و تحقیقی جائزہ	ماورا پبلشرز، لاہور	۲۰۱۵ء
۱۰۱۔ عبدالحلیم شرر	اسلامی سوانح عمریاں	شاہی پریس لکھنو	۱۹۶۱ء
۱۰۲۔ غلام رسول مہر	غالب	مسلم پرنٹنگ پریس، لاہور	۱۹۳۶ء
۱۰۳۔ غلام رسول مہر	سیرت امام ابن تیمیہ	کریمی پریس، لاہور	۱۹۲۵ء
۱۰۴۔ غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر	ادبی جائزے	الکتاب، آرام باغ روڈ، کراچی	۱۹۶۵ء
۱۰۵۔ غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر	تحقیقی جائزے	بزم غالب، سکھر	۱۹۶۸ء
۱۰۶۔ فرمان فتح پوری	اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	مجلس ترقی ادب، لاہو	۱۹۷۲ء
۱۰۷۔ فرزانہ کوکب، ڈاکٹر	عصمت چغتائی روایت شکنی سے روایت سازی تک	فکشن ہاؤس، لاہور	۲۰۱۸ـ۱۹ء
۱۰۸۔ قدرت اللہ شہزاد	اردو کے چند خاکہ نگار	مکتبہ الہام، بہاولپور	۲۰۰۷ء

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۱۰۹۔ قاضی عبدالغفار	آثار ابوالکلام آزاد	کوہ نور پریس، دہلی	۱۹۵۸ء
۱۱۰۔ قدرت اللہ شہاب	شہاب نامہ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۶ء
۱۱۱۔ قاضی عبدالغفار	حیات اجمل		۱۹۵۰ء
۱۱۲۔ قیصری بیگم	کتاب زندگی	فضلی سنز، کراچی	۲۰۰۳ء
۱۱۳۔ قاسم یعقوب (مرتب)	اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کے مباحث	سٹی بک پوائنٹ	۲۰۱۷ء
۱۱۴۔ قاضی جاوید	سرسید سے اقبال تک	فکشن ہاؤس، لاہور	۲۰۰۷ء
۱۱۵۔ کلیم الدین احمد	اپنی تلاش میں	ہندلیتھو پریس گیا	۱۹۷۵ء
۱۱۶۔ گیان چند جین، ڈاکٹر	تحقیق کا فن	مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد	۲۰۱۲ء
۱۱۷۔ مولانا عبدالسلام ندوی	سیرت عمر بن عبدالعزیز	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۲۳ء
۱۱۸۔ مولانا عبدالسلام ندوی	اقبال کامل	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۶۴ء
۱۱۹۔ مولانا عبدالسلام ندوی	امام رازی	مطبع معارف اعظم گڑھ	۱۹۵۰ء
۱۲۰۔ مولوی عبدالحق	چند ہم عصر	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۱۹۵۰ء
۱۲۱۔ مالک رام	ذکر غالب	جید پریس، دہلی	۱۹۵۰ء
۱۲۲۔ مالک رام	وہ صورتیں الٰہی	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۸ء
۱۲۳۔ مالک رام	رشید احمد صدیقی کردار افکار و گفتار	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۵ء
۱۲۴۔ ملا واحدی	سوانح عمری خواجہ حسن نظامی	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	۱۹۵۷ء
۱۲۵۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر	رسمیاتِ مقالہ نگاری	پاکستان اسٹیڈی سینٹر، جامعہ کراچی	۲۰۰۹ء
۱۲۶۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر	اردو تحقیق	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۲۰۰۸ء
۱۲۷۔ محمد شکیل اوج، حافظ	منہاج تحقیق	یونیورسٹی پبلی کیشنز، کراچی	۱۹۹۵ء
۱۲۸۔ محمد حسین آزاد	آبِ حیات	مکتبہ عالیہ، لاہور	۱۹۹۰ء
۱۲۹۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر	لطیف نثر	جی۔ ایف۔ پرنٹنگ پریس، لاہور	۱۹۷۶ء
۱۳۰۔ ممتاز مفتی	اوکھے لوگ	یونیورسل بکس، لاہور	۱۹۸۶ء

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۱۳۱۔ ممتاز فاخرہ، ڈاکٹر	اردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء	رونق پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۴ء
۱۳۲۔ مختار مسعود (مرتبہ)	آئی ونٹیس آف ہسٹری (انگریزی)	گلڈ پبلیشنگ ہاؤس، کراچی	۱۹۶۸ء
۱۳۳۔ مختار مسعود	آواز دوست	النور ۲۲ کو پر روڈ، لاہور	۱۹۸۸ء
۱۳۴۔ مختار مسعود	سفر نصیب	شاہ بیگم اور شیخ عطااللہ ٹرسٹ	۲۰۱۷ء
۱۳۵۔ مختار مسعود	لوح ایام	العطاء ۷۷ شادمان ۲، لاہور	۲۰۰۱ء
۱۳۶۔ مختار مسعود	حرف شوق	العطاء ۷۷ شادمان ۲، لاہور	۲۰۱۷ء
۱۳۷۔ محمد اقبال جاوید، پروفیسر	مختار مسعود مکاتیب کے آئینے میں	سجاد کمپوزنگ سنٹر، گوجرانوالا	۲۰۱۷ء
۱۳۸۔ ماہر القادری (مرتبہ، طالب ہاشمی)	قلمی معرکے (ج، اول)	القمر انٹر پرائز، لاہور	۲۰۰۴ء
۱۳۹۔ ماہر القادری (مرتبہ، طالب ہاشمی)	قلمی معرکے (ج، دوم)	القمر انٹر پرائز، لاہور	۱۹۹۴ء
۱۴۰۔ مزمل احمد	فارسی ضرب الامثال اور کہاوتیں	فیروز سنز، لاہور	۲۰۰۵ء
۱۴۱۔ محمد رضی راہی	مولوی عبدالحق حیات و اسلوب	ادارہ مجلس ادبیات پاکستان، کراچی	۱۹۹۹ء
۱۴۲۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر	اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت	فکشن ہاؤس، لاہور	۲۰۱۲ء
۱۴۳۔ میمونہ بیگم، ڈاکٹر	مرزا محمد ہادی رسوا	س ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۳ء
۱۴۴۔ محمود علی خاں جامعی	تذکرہ جگر	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۲ء
۱۴۵۔ محی الدین قادری زور	روح غالب	مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدر آباد	۱۹۳۹ء
۱۴۶۔ مرزا فرحت اللہ بیگ	ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۶ء
۱۴۷۔ منظر عباس نقوی	اسلوبیاتی مطالعے	ایجوکیشنل بک فاؤنڈیشن، علی گڑھ	۱۹۸۹ء
۱۴۸۔ مظہر مہدی، ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو سوانحی ادب	ساہتیہ اکیڈمی، دہلی	۲۰۰۲ء
۱۴۹۔ محمد طفیل	صاحب	استقلال پریس، لاہور	۱۹۵۵ء
۱۵۰۔ محمد طفیل	جناب	ادارہ فروغ اردو، لاہور	۱۹۶۱ء
۱۵۱۔ محمد طفیل	آپ	ادارہ فروغ ادب، لاہور	۱۹۶۷ء

مصنف رمولف رمترجم	کتاب کا نام	ناشر رادارہ	سن اشاعت
۱۵۲۔ محمد طفیل	محترم	ادارہ فروغ اردو، لاہور	۱۹۶۸ء
۱۵۳۔ محمد حامد سراج (مرتبہ)	ناموراد یبوں کی آپ بیتیاں	بک کارنر جہلم، پاکستان	۲۰۱۷ء
۱۵۴۔ محمد نعیم صدیقی ندوی	سید سلیمان ندوی: شخصیت اور ادبی خدمات	مکتبہ فردوس، لکھنو	۱۹۷۳ء
۱۵۵۔ مشتاق احمد یوسفی	زرگزشت	مکتبہ دانیال، کراچی	۱۹۷۶ء
۱۵۶۔ نثار احمد زبیری، ڈاکٹر	تحقیق کے طریقے	شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی	۲۰۰۹ء
۱۵۷۔ نسیم انصاری، ڈاکٹر	جواب دوست	آج کتب خانہ، کراچی	۱۹۹۷ء
۱۵۸۔ نصر اللہ خان	کیا قافلہ جاتا ہے	مکتبہ تہذیب وفن، کراچی	۱۹۸۳ء
۱۵۹۔ وفاراشدی، ڈاکٹر	میرے بزرگ میرے ہم عصر	مکتبہ اشاعت اردو، کراچی	۱۹۹۵ء
۱۶۰۔ وقار عظیم	ہماری داستانیں	ادارہ فروغ اردو، لاہور	۱۹۵۶ء
۱۶۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر	اردو کا بہترین انشائی ادب	مکتبہ میری لائبریری، لاہور	۱۹۷۱ء
۱۶۲۔ وحید قریشی، ڈاکٹر	میر حسن اوران کا زمانہ	بک لمیٹڈ، لاہور	۱۹۵۷ء
۱۶۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر	مطالعہ حالی	دارالادب، لاہور	۱۹۶۷ء
۱۶۴۔ وحید قریشی، ڈاکٹر	شبلی کی حیات معاشقہ	مکتبہ جدید، لاہور	۱۹۵۰ء
۱۶۵۔ وارث سرہندی (مرتبہ)	قاموس مترادفات	اردو سائنس بورڈ، لاہور	۲۰۰۱ء
۱۶۶۔ وزیر حسن	بلبل ہند سروجنی نائیڈو	حیدرآباد دکن	۱۹۵۷ء

☆☆

فہرستِ لغات اور دائرہ معارفِ محولہ

(الف) لغات

۱۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۔۲۱، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کراچی ۱۹۷۷ء تا ۲۰۰۷ء

۲۔ المنجد (عربی ⁄ اردو) دار الاشاعت، کراچی ۱۹۹۴ء

۳۔ امیر اللغات (مرتبہ) امیر مینائی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۸۹ء

۴۔ اوکسفرڈ، اردو انگریزی لغت (مرتبہ) ایس ایم سلیم الدین ⁄ سہیل انجم، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، پاکستان ۲۰۱۳ء

۵۔ جامع اللغات (مرتبہ) خواجہ عبد المجید اردو سائنس بورڈ، لاہور ۲۰۰۳ء

۶۔ علمی اردو لغت جامع (مرتبہ) وارث سرہندی، علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۹۶ء

۷۔ فیروز اللغات (مرتبہ) الحاج فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور ۱۹۶۵ء

۸۔ فرہنگ آصفیہ (مرتبہ) سید احمد دہلوی، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۹۔ فرہنگ تلفظ (مرتبہ) شان الحق حقی مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۵ء

(ب) دائرہ معارف

۱۔ انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، (مدیر) سید قاسم محمود، شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی (طبع اول) مارچ ۱۹۹۸ء

۲۔ پاکستان کرونیکل (مرتبہ) عقیل عباس جعفری، فضلی سنز، کراچی ۲۰۱۰ء

فہرست رسائل محولہ

۱۔ ہفت روزہ ’فیملی میگزین‘ لاہور، ۳۰ر اپریل تا ۶ر مئی ۲۰۱۷ء

۲۔ ہفت روزہ ’فرائیڈے اسپیشل‘ کراچی، ۱۸ر اگست ۲۰۱۷ء

۳۔ ماہنامہ ’مست قلندر‘ لاہور، آپ بیتی نمبر، اگست ۱۹۳۹ء

۴۔ ماہنامہ ’نقوش‘ لاہور، آپ بیتی نمبر، ش۔ ۱۰۰واں، حصہ (اول، دوم) جون ۱۹۶۴ء

۵۔ ماہنامہ ’نقوش‘ لاہور، ش۔ ۱۱۲، اگست ۱۹۶۹ء

۶۔ ماہنامہ ’نگار پاکستان‘ کراچی، اصناف ادب نمبر، ش۔ ۱۲، دسمبر ۱۹۶۶ء

۷۔ ماہنامہ ’شاہکار‘ لاہور، خصوصی اشاعت (آوازِ دوست۔۔۔ میری رائے میں) یکم مئی ۱۹۷۵ء

۸۔ ماہنامہ ’روپ‘ کراچی، ج۔ ۴، ش۔ ۴، اکتوبر ۱۹۸۳ء

۹۔ ماہنامہ ’اخبارِ اردو‘ اسلام آباد، ج ۳۵، ش ۵۔ ۶، مئی ر جون ۲۰۱۷ء

۱۰۔ ماہنامہ ’قومی زبان‘ کراچی، ج۔ ۸۹، ش۔ ۵، مئی ۲۰۱۷ء

۱۱۔ ماہنامہ ’قومی زبان‘ کراچی، ج۔ ۹۱، ش۔ ۷، جولائی ۲۰۱۹ء

۱۲۔ ماہنامہ ’پرواز‘ لندن، ج۔ ۱۷، ش۔ ۵، اگست ۲۰۱۷ء

۱۳۔ ماہنامہ ’الحمرا‘ لاہور، ج۔ ۱۷، ش۔ ۱۰، اکتوبر ۲۰۱۷ء

۱۴۔ ماہنامہ ’ماہِ نو‘ کراچی، ج۔ ۱۶، ش۔ ۱، جنوری ۱۹۶۳ء

۱۵۔ سہ ماہی ’الزبیر‘ بہاولپور، ش۔ ۲، ۱۹۸۰ء

۱۶۔ سہ ماہی ’الاقربا‘ راولپنڈی، شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۸ء

۱۷۔ ششماہی ’ثبات‘ اسلام آباد، ج۔ اول، ش۔ دوم، جنوری تا جون ۲۰۱۸ء

۱۸۔ ششماہی ’صحیفہ‘ لاہور، ش۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱، جنوری ۲۰۱۵ء۔ جون ۲۰۱۵ء

۱۹۔ کتابی سلسلہ ’کولاژ‘ کراچی، ش۔ ۸، دسمبر ۲۰۱۷ء

۲۰۔ کتابی سلسلہ ’دستاویز‘ دوحہ ر دہلی، نمبر۔ ۴، ۲۰۱۶ء

فہرست اخبارات محولہ

۱۔ روزنامہ، 'ایکسپریس' لاہور، منگل ۱۸/اپریل ۲۰۱۷ء

۲۔ روزنامہ، 'ایکسپریس' لاہور، جمعرات ۲۰/اپریل ۲۰۱۷ء

۳۔ روزنامہ، 'ایکسپریس' لاہور، جمعہ ۲۱/اپریل ۲۰۱۷ء

۴۔ روزنامہ، 'پاکستان' لاہور، منگل ۱۸/اپریل ۲۰۱۷ء

۵۔ روزنامہ، 'جنگ' کراچی، بدھ ۱۹/اپریل ۲۰۱۷ء

۶۔ روزنامہ، 'جنگ' لاہور، پیر ۱۷/اپریل ۲۰۱۷ء

۷۔ روزنامہ، 'خبریں' لاہور، ہفتہ ۹/جولائی ۲۰۱۶ء

۸۔ روزنامہ، 'دنیا' کراچی، پیر ۱۷/اپریل ۲۰۱۷ء

۹۔ روزنامہ، 'نوائے وقت' کراچی، پیر ۱۵/مئی ۲۰۱۷ء

۱۰۔ روزنامہ، 'نئی بات' لاہور، منگل ۱۴/اپریل ۲۰۲۰ء

۱۱۔ روزنامہ، '۹۲ نیوز' لاہور، بدھ ۱۹/اپریل ۲۰۱۷ء

۱۲۔ روزنامہ، '۹۲ نیوز' کراچی، اتوار ۱۶/دسمبر ۲۰۱۸ء

ویب گاہ

1- www.Awaza.com/wp-content/uploads/2020

/05Dr.Zahid Muneer-Amir.png

مقالہ جات

۱۔ مظفر حسین	مختار مسعود کی ادبی خدمات علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد	مقالہ برائے ایم فل (اردو) ۲۰۱۰ء
۲۔ محمد شمشیر	آوازِ دوست۔ حواشی و تعلیقات علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد	مقالہ برائے ایم فل (اردو) ۲۰۱۹ء

☆☆

تحقیق کے میدان میں مخصوص مزاج لوگ ہی سرخرو ہوتے ہیں ورنہ اکثر کے تو آدھی مسافت میں ارادے ٹوٹتے دیکھے ہیں۔ کافی دنوں بعد شعبہ اردو جامعہ کراچی سے بہت ہی عمدہ اور مستقبل بین تحقیقی کام ''مختار مسعود کی سوانح نگاری'' صاحب نظر نقاد، ماہر اقبالیات اور منفرد لہجہ کے شاعر سیّد احمد ہمدانی کی صاحبزادی پروفیسر ڈاکٹر راحت افشاں کی نگرانی میں، استاد شعبہ اردو شہید ملت گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین عزیز آباد، کراچی شازیہ ظہور نے کیا ہے۔ ان کا تعلق شاہ لطیف ''سچل سرمست'' اور شیخ ایاز کی بیت، وائی اور کویتا سے گونجنے والی وادی مہران کے شہر میرپور خاص سے ہے۔ محقق کے لیے یہ اعزاز باعث فخر ہے کہ وہ اپنی جنم بھومی کی پہلی لڑکی ہیں جنھوں نے ایم فل اردو ادبیات کی سند حاصل کی ہے۔

شازیہ ظہور زمانہ طالب علمی سے نصابی وہم نصابی سرگرمیوں میں متحرک وفعال رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج کنری، عمرکوٹ سندھ سے کیا۔ درس وتدریس کے ساتھ ہی استاد رہنما کے بہ حیثیت نائب صدر بزم اساتذہ اردو (رجسٹرڈ) سندھ اور رکن پاکستان آرٹس کونسل، کراچی سماجی علمی وادبی میدان میں متحرک ہیں۔

انھوں نے ''مختار مسعود کی سوانح نگاری'' جیسے متحیر موضوع پر عرق ریزی سے تحقیق کے ضوابط ومعیارات کے مطابق ایک نئی جہت سے اردو ادب کے دبستان نثر کو روشناس کروایا ہے ابھی اس حوالے سے تحقیق کے مزید نئے زاویے اور امکانات سامنے آئیں گے لیکن ''سوانح نگار'' کی حیثیت سے دبستان اردو نثر میں مختار مسعود کی دریافت کا سہرا شازیہ ظہور کے سر ہی رہے گا۔

یہ امر باعث خوشی اور علمی لحاظ سے گراں قدر ہے کہ بقائی یونی ورسٹی کراچی نے کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر کے علمی وتحقیقی معیار کو سند کا درجہ عطا کیا ہے اس کے لیے میں رئیس جامعہ پروفیسر ڈاکٹر زاہدہ بقائی مجلس علمی کے اراکین علم وفضل اور ڈائریکٹر مطبوعات وتعلقات عامہ سید محمد ناصر علی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

بتاریخ: یکم ستمبر ۲۰۲۱ء

ڈاکٹر عرفان شاہ

صدر شعبہ اردو

سراج الدولہ گورنمنٹ ڈگری کالج نمبر ۱

ایف سی ایریا، کراچی۔